DECEMBER
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

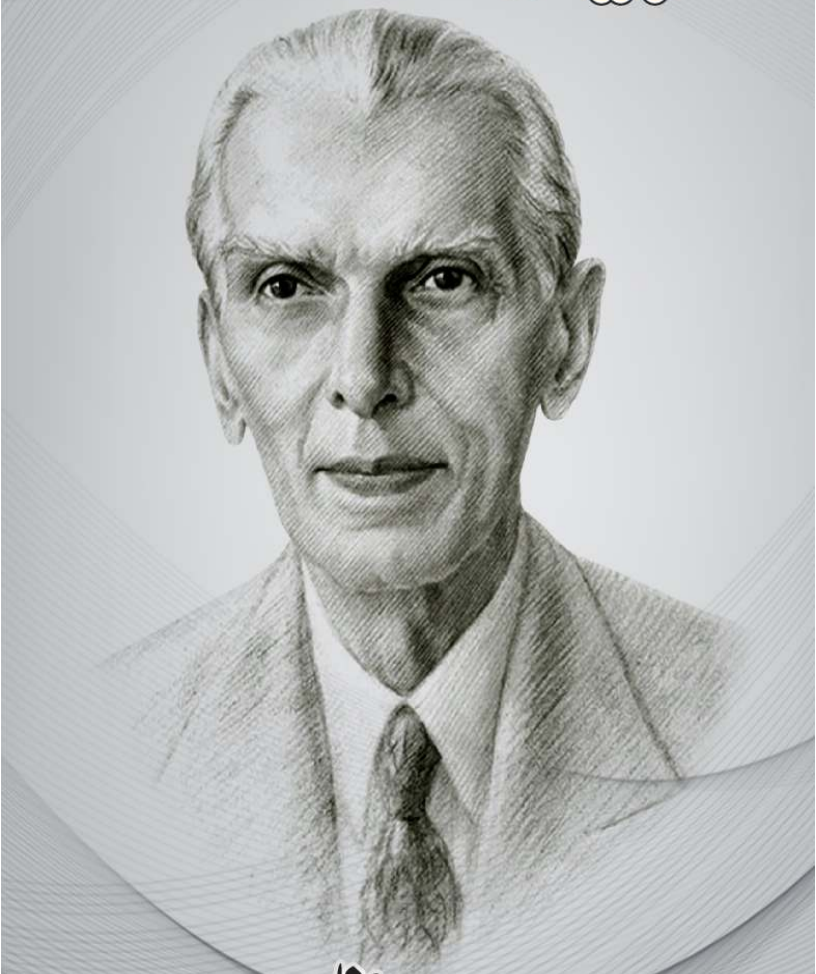

لاہور

پاسبان ملت کا ہے قائدِ اعظم محمد علی جناح

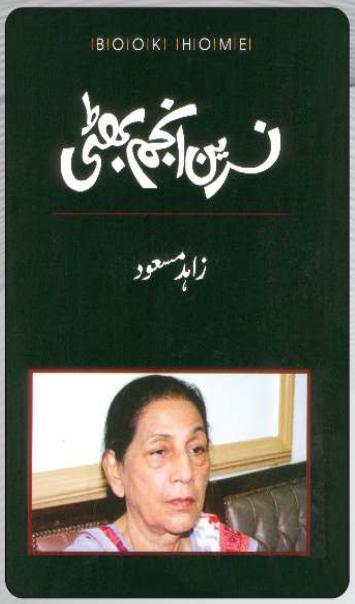

BOOK HOME
نسرین انجم بھٹی
زاہد مسعود

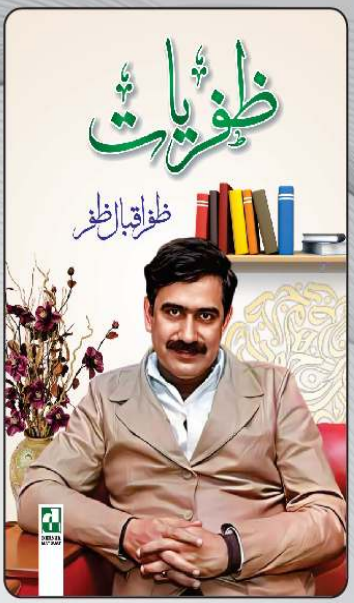

ظفریات
ظفر اقبال ظفر

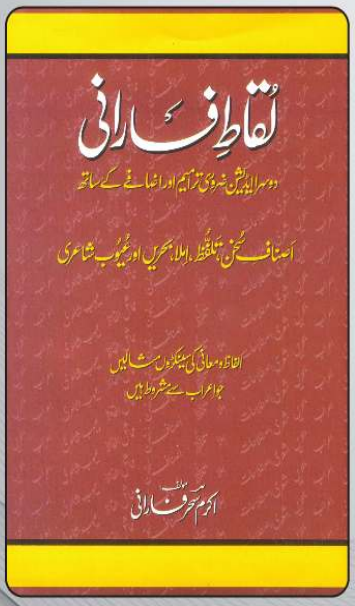

لُقاطِ فارانی
دوسرا ایڈیشن ضروری ترامیم اور اضافے کے ساتھ
اصنافِ سُخن، تلفّظ، املا، بحریں اور عُیوب شاعری
الفاظ و معانی کی سینکڑوں مثالیں
جو اعراب سے مشروط ہیں
مؤلف
اکرم سحر فارانی

خواب زندہ رہتے ہیں
عرفان صادق

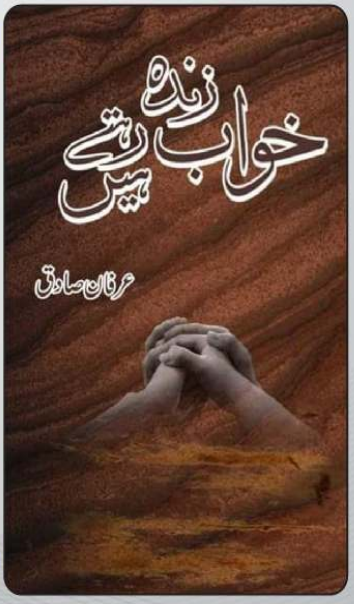

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

بین کرنے لگیں نہ سناٹے
پاسدارانِ گوش و گویائی

کس نے توفیق سے سوا پایا
دل نے غم ، آنکھ نے نمی پائی

عشق کا اَجر ہے دِل رسوا
پارسائی ، عذابِ دانائی

یہ اُسی شہر کے منارے ہیں
اے تحیّرِ سرشت بینائی

چار جانب وہی دھندلکے ہیں
گمرہو! پھر وہی گلی آئی

ناسپاسوں میں باوقار نہ بن
اے مری بے وقار گویائی

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - دسمبر 2023 - شمارہ نمبر: 12

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: قائداعظم محمد علیؒ جناح

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے زریاب لیڈ ملٹی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، نزد اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، سرور حسین نقشبندی	7 تا 8
2	نعت	جلیل عالی، محمد یٰسین قمر، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، شوکت محمود شوکت، افروز رضوی، سرور حسین نقشبندی، نبیل احمد نبیل، ریاض ندیم نیازی، صغیر احمد صغیر، سجاد حسین ساجد، امجد بابر، علی بن عزیز	9 تا 21
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	22
4	افسانے	ابدال بیلا، سیما پیروز، نیلما ناہید درانی، کلیم خارجی، نجم رضوی، عزیز عادل	23 تا 66
5	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، خاور اعجاز، راحت سرحدی، صفدر صدیق رضی، احمد جلیل، قیوم طاہر، مسعود احمد، نثار ترابی، اقبال سروبہ، اجمل اعجاز، شہزاد نیر، اعجاز روشن، شبہ طراز، رخشندہ نوید، ریاض ندیم نیازی، فیض رسول فیضان، اکرم ناصر، آفتاب خان، اعجاز دانش، خالدہ انور، عقیل رحمانی، شوکت محمود شوکت، مرزا اسکندر بیگ	67 تا 144

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
5	غزلیں	افروز رضوی، ذکی طارق، رانا سعید دوشی، محمد سلیم ساگر نبیل احمد نبیل، میتھیو محسن، افتخار شوکت، انصر حسن رضا اللہ حیدر، علمدار حسین، سحر تاب رومانی، شاہد اشرف رخسانہ سمن، افتخار شاہد، اکرم سحر فارانی، محمد اشرف کمال عابد معروف مغل، اکرم جاذب، مستحسن جامی، ازور شیرازی نائیلہ راٹھور، ردا حاصل خلوص، کوکی گل، فرح شاہد شہاب اللہ شہاب، اکمل حنیف، انصر منیر، بشیر احمد حبیب محمود کیفی، سرفراز عارض، محمد اشفاق بیگ، امجد بابر احمد سجاد بابر، اسد رضا سحر، یاسر رضا آصف، محمد کلیم عاصم بخاری، جیا قریشی، ساگر حضور پوری، عبدالرؤف زین عابد رضا، عنبرین خان، خالق آرزو، محمد علی ایاز، قمر نیاز نادیہ سحر، عزیز قدیر مغل، نعمان محمود ، ثاقب سیال	67 تا 144
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	145 تا 152
7	مضامین	خالد علیم، نسیم سحر، ثمینہ سید، نبیل احمد نبیل، گل اکبر خان رانا محمد شاہد، عادل سعید قریشی، حسیب اعجاز عاشر، آفتاب خان سنی ذیشان علی پوری، رشیدہ منصوری، ظفر اقبال ظفر	153 تا 202
8	طنز و مزاح / خاکے	نبیل قیصر، نور کمال شاہ، محمد کلیم، اعجاز رضوی	203 تا 212
9	نظمیں	جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، ریاض مجید، گلزار بخاری خاور اعجاز، سید افسر ساجد، محمد انیس انصاری، طالب انصاری افتخار شوکت، فرخندہ شمیم، رخشندہ نوید، تابش کمال، محمد سلیم ساگر علی حسین عابدی، اکرم سحر فارانی، ریاض ندیم نیازی صغیر احمد صغیر، علمدار حسین، عاطف جاوید عاطف، غلام مرتضیٰ نائلہ راٹھور، محسن خالد محسن، زاہد خان، ذوالفقار شاذ عائشہ احمد جاوید، عاصم بخاری، شائستہ رمضان، اعجاز رضوی	213 تا 241

حمد

حسن عسکری کاظمی

حرفِ کن سے بن گئے ہیں اے خدا کون و مکاں
کھل نہ پایا آج تک ہم پر یہی سرِّ نہاں

یہ وطن تو نے دیا اے مالکِ کون و مکاں
خوش نصیبی ہے، ہوئے آباد ہم بھی سب جہاں

کوئی مانے یا نہ مانے اے خدا تیرا وجود
ہم تری مخلوق ہیں تو ہے ازل سے حکمراں

ترے قرآں کی تلاوت ہو رہی ہے جا بجا!
کس کے روکے سے رُکا ہے آج تک سیلِ رواں

علم بڑھنے سے ہوا ہے منکشف ہم پر یہی
قوتِ تخلیق کا ذرّہ ہوا مظہر یہاں

نام لیواؤں سے نفرت کا سبب کھلتا نہیں
سوزشِ غم کے سبب اُٹھنے کو ہے دل سے دھواں

باوضو ہو کر حسن سر سے کفن باندھیں گے ہم
دشتِ کربل سے ابھی تک آ رہی ہے اک اذاں

حمد

تو ہی مولا تو ہی مالک ستار و غفار
تو ہی خالق تو ہی رازق جبار و قہار

تیری مرضی سے چلتی ہے کائنات کی نبض
تیرے حکم کے آگے مولا کون کرے انکار

دل پر جتنے قفل لگے ہیں اک اک کر کے کھول
مجھ میں جتنے پوشیدہ ہیں اپنے نقش ابھار

تیری قدرت کے جلوے ہیں ہر سو ایک سے ایک
تیری صناعی کے مظہر کیا سے کیا شہکار

باقی تیری ذات ہے مولا فانی سب اشیا
مال و دولت حسن جوانی سب ہے ایک غبار

ہر اک راگ کی رگ رگ میں ہے تیری یاد کا سوز
کیا بھیرو کیا درباری کیا دیپک کیا ملہار

تیری یاد میں گم ہو جاؤں اور ہوں میرے ساتھ
ذکر کی مشعل، سوز کا تکیہ، تنہائی کا غار

تیرے کرم سے مٹ جاتا ہے باطل کا ہر نقش
تیری رحمت دھو دیتی ہے عصیاں کے انبار

تیری قدرت کا ہے یہ بھی ایک نرالا رنگ
میں خاروں کی جھاڑی اور یہ حمد کا لالہ زار

ذرے ذرے کے لب پر ہے تیرا اسم رواں
تیری جانب لے آتی ہے پانی کی جھنکار

سرور دنیا داروں کی پھر کیوں پروا کرے
سجدہ ریز ہے تیرے آگے تجھ سے عرض گزار

سرور حسین نقشبندی

نعت

گرمِ سفر ہیں ہم جو غموں کے غبار میں
رہتے ہیں اک نگاہِ کرم کے حصار میں

اک جوئے ہُو کہ اپنی نمو کا سبب ہوئی
ورنہ تھے کب کسی بھی شمار و قطار میں

اُس ماہتابِ عرش و زمین و زماںؐ کا ذکر
تسکیں اتارتا ہے دلِ بیقرار میں

اک ہالہ ہدیٰ نے پناہوں میں لے لیا
تھی سمتِ سعد اپنے کہاں اختیار میں

ارض و سما کے واسطے لازم جو نور تھا
اوّل رکھا گیا مہِ رحمتؐ شعار میں

اس شارحِ حقیقتِ وحدت کو یاد کر
تالیف چاہتا ہے اگر انتشار میں

عالی ملی یہ صاحبِ فرقاںؐ سے آگہی
اصل امتیاز کیا ہے یمین و یسار میں

جلیل عالی

نعتؐ

یہ نعت خدمت قبول کر لیں
حضورؐ چاہت قبول کر لیں

کھڑا ہوں در پر میں سر نہادہ
مری عقیدت قبول کر لیں

یہ چند آنسو ندامتوں کے
مری خجالت قبول کرلی ں

میں لفظ و معنٰی سے نابلد ہوں
کریم! حیرت قبول کر لیں

سخن قرینے کہاں سے لاؤں
مری یہ لکنت قبول کر لیں

درود میرا ، سلام میرا
بحقِ رحمت! قبول کر لیں

ہو لطف مجھ پر بلال صورت
یہ دل کی رقت قبول کر لیں

حضورؐ ! سب سے غریب ہوں میں
حضورؐ! دعوت قبول کر لیں

قمر کے جذبوں کا حرف پارہ
برنگِ مدحت قبول کر لیں

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

آپؐ کا لطف و کرم یا در ہوا
ناتواں انسان بھی جاں بر ہوا

آپؐ نے ویرانیاں آباد کیں
قریہ قریہ خلد کا منظر ہوا

فیض عشق مصطفیٰؐ اکسیر ہے
ذرہ ذرہ مہر کا ہم سر ہوا

بے یقیں افراد کو پر لگ گئے
غالب و کار آفریں لشکر ہوا

شرک کا نام و نشاں مٹتا گیا
بت کا خواہاں حمد کا خوگر ہوا

آب و گل میں رونقیں آتی گئیں
زشت رو رشکِ مہ و اختر ہوا

صحبتِ اہل ورع کام آگئی
ذکرِ پاک مصطفیٰؐ گھر گھر ہوا

جاں نثارِ مصطفیٰؐ کی شان ہے
کج کلاہوں کا نشاں کم تر ہوا

میں ریاضِ خلد میں آباد ہوں
نعت خوانی مشغلہ بہتر ہوا

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

ابتداً ذکرِ نبیؐ اور انتہاً ذکرِ نبیؐ
یعنی کیجیے اوّل و بعدِ دعا ذکرِ نبیؐ

موت نے پوچھا: تمھاری آخری خواہش کوئی
مَیں نے کچھ سوچے بنا اُس سے کہا: ذکرِ نبیؐ

میری حیثیت سے بڑھ کر قدر افزائی ہُوئی
اُس نے میرے دل میں جاری کر دیا ذکرِ نبیؐ

کوئی اُنؐ کے سربرآوردوں کا اندازہ کرے
مجھ سے کم توفیق کا ہے معجزہ ، ذکرِ نبیؐ

ذرّہ ذرّہ کہتا ہے خاورؔ زبانِ حال سے
نورِ دل ، تسکینِ جاں ، راحت فزا ذکرِ نبیؐ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے ، جاگیں چوکی دار

نعتؐ

آپؐ کے آنے سے روشن یہ جہاں سارا ہوا
مہرباں اہلِ جہاں پر ، آسماں سارا ہوا

گلشنِ ہستی پہ جیسے عود کر آئی بہار
اس طرح نابود ، پندارِ خزاں سارا ہوا

آپؐ کی رفعت کا شہرہ ، وسعتِ افلاک میں
آپؐ کا دشمن یقیناً بے نشاں سارا ہوا

کب ثنائے مصطفیٰؐ ، ہم سے بیاں ساری ہوئی
نعت میں ذکرِ محمدؐ ، کب بیاں سارا ہوا

جب بلاوا آ گیا تو جانبِ طیبہ ، حضورؐ
کاروانِ عشق فوراً پھر رواں سارا ہوا

اس طرح طیبہ پہ برسیں ، بارشیں انوار کی
شہرِ طیبہ ، باعثِ رشکِ جناں سارا ہوا

اک ذرا شوکت مدینے پہنچنے کی دیر تھی
قلبِ ویراں ، پھر وہاں پر شادماں سارا ہوا

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

نبی سے محبت کا اک سلسلہ ہے
جو تحفہ درودوں کا بخشا ہوا ہے

یہ اللہ کا احسان مجھ پر ہوا ہے
مدینے کا در جس نے دکھلا دیا ہے

وہ پل میں سوئے عرش ہو کر بھی آئے
خدا سے تو ان کا الگ رابطہ ہے

انہیں یہ فضیلت عطا کی خدا نے
کہ شق القمر ان کا اک معجزہ ہے

سبھی انبیا برگزیدہ ہیں لیکن
خدا اور محمدؐ کا ناطہ جدا ہے

محبت سے نعتِ نبی لکھ رہی ہوں
مری نعت گوئی ، خدا کی عطا ہے

ہے افروز امت پہ احسان رب کا
ہدایت پہ چلنے کو قرآں دیا ہے

افروز رضوی

نعتؐ

ہر ایک خواہش دنیا مٹائی جاتی ہے
درِ نبی کی لگن جب لگائی جاتی ہے

فرشتے نور کی چادر وہاں بچھاتے ہیں
جہاں حضور کی محفل سجائی جاتی ہے

نبی کے نام کی نسبت کا فیض تو دیکھو
غلام کے لئے مسند بچھائی جاتی ہے

کسی فقیر نے رکھ کر یہ دل پہ ہاتھ کہا
یہاں نبی کی محبت بسائی جاتی ہے

کبھی بھی ان کا عقیدہ بگڑ نہیں سکتا
جنھیں بھی نعت کی لوری سنائی جاتی ہے

جبھی ہے موجِ تبسم سرِ لحد لب پر
یہاں وہ صورت زیبا دکھائی جاتی ہے

نبی کا عشق بسا ہو تو روح بعدِ وصال
پھر ایک بار مدینے میں لائی جاتی ہے

جب ان کی نعت کہو تو درود پڑھتے رہو
کہ ایسے حرف میں خوشبو ملائی جاتی ہے

متاعِ دنیا و عقبیٰ ہے نعت ہی سرور
کہوں کچھ اور تو ساری کمائی جاتی ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

روضۂ پاک کا مجھ کو بھی نظارا ہو جائے
حشر میں میری شفاعت کا سہارا ہو جائے

یادِ محبوب میں، آنکھوں میں دمک ایسی ہو!
میری پلکوں کا ہر اِک اشک ستارا ہو جائے

تُو نے بخشی ہے زمانوں کو زیارت اپنی
مجھ کو بھی تیری حضوری کا اشارہ ہو جائے

تیرے روضے پہ میں پہنچوں، ترے در کو دیکھوں
آنکھ کا دِید کا شوق انجمن آرا ہو جائے

اب ہے گِرداب حوادث میں سفینہ میرا
حاصل اِس کو تری رحمت کا کنارا ہو جائے

زندگی میری گُزر جائے ترے قدموں میں
یہی محشر میں کرم مجھ پہ دوبارہ ہو جائے

خاک بن جائے ترے قریۂ روشن کی نبیلؔ
یوں بلند اُس کے مقدر کا ستارہ ہو جائے

نبیل احمد نبیلؔ

نعتؐ

دیکھنا محشر میں ختم الانبیا کی آن بان
دیدنی ہو گی وہاں پر مصطفیٰؐ کی آن بان

ہے کہیں دربار کوئی مثلِ دربارِ نبیؐ
سبز گنبد میں ہے دیکھو کس بلا کی آن بان

زائرو تم نے تو دیکھی ہے کہو کیسی لگی؟
جالیوں سے چھنتے والی وہ ضیا کی آن بان

محوِ حیرت تھے فرشتے دیکھ کر جاتے ہوئے
جانبِ سدرہ حبیبِ کبریا کی آن بان

ہاں یوں ہی قائم رہے گی یہ قیامت تک ندیم
کم نہیں ہو گی درِ خیرالوریٰ کی آن بان

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرخ ہوئے، پھر نور نمو سے، پھولوں کے رخسار
عکس جمال یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

نعتؐ

کوئی فاصلہ نہیں فاصلہ مرے سامنے
کہ ہے دم بہ دم درِ مصطفیٰؐ مرے سامنے

یہ مرے نبی کی عنایتوں کا کمال ہے
کوئی غم کبھی نہ ٹھہر سکا مرے سامنے

مجھے اور کوئی دلیل اب نہیں چاہیے
ہے کتاب آپ کا معجزہ مرے سامنے

کبھی اے خدا مری یہ دعا بھی قبول کر
کہ ہو خواب میں رخِ والضحیٰ مرے سامنے

مری سوچ بدر و حنین جا کے ٹھہر گئی
مجھے یوں لگا کہ وہ سب ہوا مرے سامنے

یہ صغیر میرا یقین ہے سرِ دو جہاں
کوئی ہے نہ تھا کہیں آپ سا مرے سامنے

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیِ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

نعتؐ

ثنائے احمدِ مرسل لبوں پہ جاری ہے
یہ وہ کرم ہے جو ہر اک کرم پہ بھاری ہے

عقیل چپ ہیں دلیلوں کی اس مسافت میں
درِ نبی پہ نگاہوں کی آہ و زاری ہے

زمین محوِ مسرت ہے تیرے آنے پر
فلک کی ضو پہ ترے عکس کی سواری ہے

حسین ہوں نہ حسیں ہے مرا عمل کوئی
مری حیات تری یاد نے سنواری ہے

سجے ہوئے ہیں سبھی شہر تیری آمد پر
ترے ہی نور سے روشن زمین ساری ہے

حسن، حسین، علی، فاطمہ کے صدقے سے
تری عنایتِ پیہم کا فیض جاری ہے

نگاہِ لطف و کرم کیجیے شہِ ابرار
کہ ایک دید کا ساجد فقط بھکاری ہے

سجاد حسین ساجد

نعتؐ

ہم تہی دست خزینے کی طرف دیکھتے ہیں
جھولی پھیلائے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

دل ہے مایوس زمانے کی زبوں حالی سے
شہرِ خوش بخت میں جینے کی طرف دیکھتے ہیں

سوکھے اشجار ہوئے خواب نگر کے سارے
ابرِ باراں کے مہینے کی طرف دیکھتے ہیں

مل ہی جائے گی شفاعت کی ضمانت اِن کو
یہ مسافر جو سفینے کی طرف دیکھتے ہیں

کچھ نہیں دیکھتے یہ لوگ محبت والے
قلبِ اطہر کے نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

ایسی گہرائی ہے باطن کے سفر کی امجد
پھر بھی پاتال سے زینے کی طرف دیکھتے ہیں

امجد بابر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

نعتؐ

قدم قدم پہ نئی کائنات ملتی ہے
درِ حبیب پہ آکر نجات ملتی ہے

جو صدقِ دل سے پکارے شہرِ مدینہ کو
اسے ہی جود و سخا کی برات ملتی ہے

یہ فنِ شعر تو لاکھوں کے پاس ہے لیکن
نصیب والے سخن ور کو نعت ملتی ہے

شعورِ ذات کا فیضان اس کے دم سے ہے
کہ عشقِ آقا میں رمز ثبات ملتی ہے

جو عاشقانِ نبی ہیں انہیں عزیز مرے
سویرا بن کے مقدر کی رات ملتی ہے

علی بن عزیز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سلسلے بند کیے ، مہر لگا دی تو نے
صفحۂ ارض پہ اک آخری اُمت لکھی

عقیدت

ظلمتِ یاس میں رَچا صل علی محمدٍ
ان کے درود کا دیا صل علی محمدٍ

صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّنَا ہم نے درود اپنے سب
کر لئے کیوں جدا جدا؟ صل علی محمدٍ

حسنِ ازل کے راز سے، عشقِ ابد کی شان تک
دونوں ہیں ان میں خود نما صل علی محمدٍ

ان کا درود ساقیٔ بادۂ خود سپردگی
رندِ رہینِ میکدہ صل علی محمدٍ

کوچۂ اتباع میں اب ہیں گدا ندامتیں
کاسۂ اشکِ التجا صل علی محمدٍ

حبسِ وجود میں کہیں گھٹ کے ہی رہ نہ جائے دل
جاں میں کھلے درِ ہوا صل علی محمدٍ

اِس بشریتِ خطا سے تو کہیں یہ بڑھ کے تھا
ہوتا میں اُن کی خاکِ پا صل علی محمدٍ

عزم و خلوص و شکر کے سوئے حرم یہ قافلے
کیوں ہیں رکے؟ کہ ہے ذرا صل علی محمدٍ

دورِ یزیدیت میں ہے منتظرِ حسین آج
پھر وہ درودِ کربلا صل علی محمدٍ

ہوتا نہ گم درود اگر میرا ریا کے شور میں
گنبدِ جاں میں گونجتا صل علی محمدٍ

آصف! اگرچہ خام تھا نالۂ غم مرا مگر
دل کہاں اس کو تھامتا؟ صل علی محمدٍ

مرزا آصف رسول

سنی گئی دُعا

ابدال بیلا

جب وہ دُعا سن لی گئی تو پھر یہ واقعہ ہوا۔

دو تھکے، دُبلے، پیاسے اونٹوں پہ چالیس دن کی مسافت کے بعد وہ فلسطین سے اس بے آب و گیاہ وادی میں پہنچے۔ وہ وادی کتھئی رنگت کے دھوپ جلے، گرم، خشک پہاڑوں کے بیچ تھی۔ وادی میں پانی کی ایک بوند نہ تھی، نہ کوئی سایہ دار درخت۔ نوکیلے پتھروں اور لال لال مٹی میں اُگی خال خال کانٹوں بھری جھاڑیاں تھیں جو اِدھر نکل آئے مسافر کے ہوا سے پھڑ پھڑاتے کھلے کپڑوں کو الجھا لیتی تھیں۔

پکڑ لیتی تھیں۔

اس وادی میں انہیں اپنی اولاد کے ایک حصے کو بسانے کے بعد خدا کا محترم گھر بنانے کے لیے کہا جانا تھا۔

وہ وادی، وادی بکہ تھی۔

وادی بکہ اس وقت تک نہ کوئی گاؤں تھا' نہ قصبہ' نہ شہر۔ دور دور تک انسانی آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ تنگ سی وادی' سب طرف سے خشک بنجر دھوپ میں کھڑے، جلے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ ان پہاڑوں میں تین درے تھے۔ یہاں آنے جانے کے یہی راستے تھے۔ ایک شمال کی سمت شام کو جاتا تھا۔ دوسرا جنوب میں دُور یمن کنارے تک پہنچاتا تھا۔ تیسری راہ

قریب کے سمندر بحر احمر کے صحرائی ساحل کنارے سے ہوتی ہوئی اوپر فلسطین کو لوٹ جاتی تھی۔ اسی راستے سے دو اونٹوں پر سوار ہو کے وہ میاں بیوی اپنے ایک شیر خوار بچے کو لئے ہوئے اِدھر لائے گئے تھے۔

آنے والا مرد چھیاسی سال کی عمر میں بھی مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا۔ خشک گرم صحرا کی لمبی مسافت سے اس کی جلد پہ سرخی مائل جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ قد دراز تھا۔ ہڈیوں کے جوڑ بھاری تھے' سر کے بال کپڑے میں بندھے تھے۔ سفر کی تکان کے باوجود خیر بانٹتے چہرے پہ چراغوں کی طرح بولتی بڑی بڑی آنکھیں بڑی جاندار تھیں۔ جدھر ایک نظر دیکھ لیتیں، لگتا اُدھر بوٹا اُگ آیا۔

یہ خدا کے انتہائی برگزیدہ نبی سیّدنا ابراھیمؑ تھے۔

ان کے ہمراہ اُن کی چالیس سالہ زوجہ سیّدہ ہاجرہؑ تھیں اور ایک شیر خوار بچہ -

وہ بچہ سیّدنا اسماعیلؑ تھا۔

اسماعیلؑ کے معنی ہیں' ''سنا گیا''۔

جسے اللہ نے سن لیا۔

پتہ نہیں حضرت اسماعیلؑ کے والد محترم سیّدنا ابراھیمؑ نے کب یہ دعا کی تھی کہ میرے اللہ، میری اولاد میں سے اپنا لاڈلا رسول لانا۔ خدا نے وہ دُعا سن لی۔ انبیاء تو خدا نے حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاقؑ کی اولاد سے زیادہ پیدا کئے - مگر جس نبیؐ آخر کو پوری بنی نوع انسانیت کے لیے معیار اور پیمانہ بنا کر بھیجنا تھا، جن کے قلب پہ اپنی کہی ہوئی ساری باتوں، سارے صحیفوں کو مکمل کر کے قرآن کی صورت میں نازل کرنا تھا، جنہیں بنائی گئیں تمام تر تخلیقات کا آقا بنانا تھا، انہیں، حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہونے کا شرف بخشا جانا تھا۔

اب خدا جانے، خدا نے پہلا فیصلہ کونسا کیا؟

اپنے گھر کو اس بے آب و گیاہ وادی میں بنوانے کا ارادہ یا اِسی وادی میں پیدا کئے جانے والے اپنے لاڈلے رسولؐ آخر کا، جن کی نسبت کو خدا اپنے گھر کی پہچان بنانا چاہتا تھا۔ شاید دونوں ارادے ایک ساتھ ہوئے ہوں۔ اپنے گھر کا جب خدا نے سوچا ہو تو اپنے آخری نبیؐ کا آبائی شہر طے کر لیا ہو، یا سب سے پہلے جب اپنے لاڈلے آخری رسولؐ کی روح تخلیق کی ہو تو ہی تہیہ کر لیا ہو کہ یہیں اپنے حبیب کے آبائی شہر میں اُس کے گھر کے پڑوس میں اپنا گھر بنوانا ہے اور اُسے اسی کے ہاتھوں سے سجوانا ہے، سارے جہاں کو دکھلوانا ہے۔

کچھ نہ کچھ، کبھی نہ کبھی طے ہوا ہوگا۔

ورنہ یہ کیسے ہوتا جو ہو گیا۔

چالیس دنوں کی دھوپ گرد، غبار اور پتھریلی صحرائی راہ پہ، سنگلاخ گرم اور خشک پہاڑوں بیچ ایک ویرانے میں، صحرائی قافلوں کے تین راستوں کے درمیان سیّدنا ابراھیمؑ اپنی

لاڈلی بیوی سیّدہ ہاجرہؑ کو اتنی دور سے لا کر بظاہر بے آسرا چھوڑ گئے۔ اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کے ساتھ۔ خود اکیلے واپس پلٹ گئے۔ چالیس دن کا وہی گزرا ہوا سفر دوبارہ گزارنے۔ جدھر ان کی پہلی بیوی سیّدہ سارہؑ ان کی منتظر تھیں۔

کہتے ہیں وہ سیّدہ سارہؑ کے کہنے سے اُدھر آئے تھے۔

سیّدہ سارہؑ چونکہ خود اس وقت تک بے اولاد تھیں، ان سے اپنے شوہر کی دوسری بیوی کا بیٹا نہ سہا گیا۔ دونوں ماں بیٹے کے دیس نکالے کا مطالبہ کر دیا۔ ماننے والے اس کہاوت کو مان بھی لیتے ہیں۔ مگر حیرت ہے انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ تو سوچیں کہ سیّدہ سارہؑ کا مطالبہ ماننے کے لیے خدا کے دوست اور انتہائی برگزیدہ نبی سیّدنا ابراہیمؑ اپنی بیوی ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو فلسطین سے لے کر سوا مہینے تک چلتے چلتے کہاں جا کے رکتے ہیں؟

کہاں بیوی اور بچے کو چھوڑتے ہیں؟

وہ کونسی جگہ تھی؟

وہ جگہ کس نے طے کی تھی؟

سیّدہ سارہؑ نے؟

سیّدہ ہاجرہؑ نے؟

سیّدنا ابراھیمؑ نے؟

یا سیّدنا ابراھیمؑ کے خدا نے؟

خدا کے حکم کے بنا، نہ وہ چلتے تھے نہ رُکتے تھے۔

دیکھنا یہ ہے وہ جگہ کونسی ہے؟

وہاں کیا تھا اس وقت اور کیا ہونے والا تھا؟

بی بی ہاجرہؑ کو بھی وہ بے آب وگیاہ ویرانہ، ویرانہ ہی لگا تھا۔

دُور دُور تک نہ پانی، نہ پانی کا نشان۔ نہ کوئی پودا، نہ کوئی پیڑ۔

نہ کوئی انسان، نہ کوئی انسانوں کی بستی۔

ایسی جگہوں پر کون رُکتا ہے، کون بچتا ہے۔

کون بستا ہے؟

مگر وہ بس گئیں۔

ٹھہر گئیں اور ہمیشہ کے لئے قائم کر دی گئیں۔

وہ بھی ایسے کہ اُن کا چلنا پھرنا، دوڑنا، رُکنا ہمیشہ کے لئے امر کر دیا گیا۔

بار بار دُہرانے کے لئے، کہ کوئی بھول نہ جائے، کوئی بھول میں نہ رہے، کہ کبھی کبھی بظاہر نظر آتے محسوس ہوتے اور موجود تمام تر خطرات کے باوجود، بغیر کسی آسودگی، کسی بھی سہارے کے، انسان نہ صرف زندہ رکھا جاتا ہے بلکہ وہ آنے والی انسانی نسلوں کا معیار بن جاتا ہے۔ ورنہ صحرا پہاڑ اور گرم سورج کے نیچے، بنا بوند پانی اور ایک ہرے پتے کے سائے کے بغیر، جہاں کیکٹس جیسے پیاس جینے والے پودے تک مر جاتے ہیں، وہاں پورے کا پورا ایک کنبہ ہی نہیں بسا، وہ جگہ، وہ مقام نسل انسانی کے تمام تر قافلوں کی منزل بنا دیا گیا۔ سمت نما بن کے آنے والے عظیم ترین رہنما کی اسی قبیلے سے آمد ہوتی ہے اور ساری دنیا کو مسافرت پہ نکلے

انہی لوگوں کے ہاتھوں بنے مقدس گھر کی طرف یہیں بلایا جاتا ہے۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں چالیس دن کی مسافت کے بعد عین اسی جگہ رُوکا گیا تھا، جہاں خدا نے اپنے گھر کا صحن سوچا تھا۔ وہاں رُکتے ہوئے، سیّدہ ہاجرہؑ نے اپنے عالی مقام خاوند سیّدنا ابراہیمؑ سے صرف ایک سوال پوچھا تھا۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکوہ، بس ایک معصوم سوال۔

''یہیں لا کے یہاں چھوڑنا، کیا اللہ کے حکم سے ہے''؟

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے غبار آلود تھکے بوڑھے چہرے پہ چمکتی ہوئی خوش کن آنکھوں سے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا اور کہا

''ہاں، اللہ کی یہی منشا ہے۔''

سیّدہ ہاجرہؑ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

اُن کا چہرہ دمک گیا۔ سوا مہینے کی دھول اور دھوپ جیسے یک لخت اُن کے چہرے سے سرک گئی۔ گود میں کلبلاتے شیر خوار بچے کی پیاس بیچ جیسے ایکا ایکی میں اُگی پکی ہوئی کھجوروں کا پیڑ اگ آیا۔ سیّدہ ہاجرہؑ دل جمعی سے مسکرائیں اور پورے اعتماد سے بولیں:

''تب ہمیں کوئی دُکھ نہیں۔

خدا کی منشا کبھی رحمت سے خالی نہیں ہوتی، وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا''۔

سیّدنا ابراہیمؑ اپنی لاڈلی بیوی کے کہے ہوئے لفظوں کو سن کے مسکرائے۔

اُن سے زیادہ کون خدا کی رحمت کا بھیدی تھا۔

وہ سمجھ گئے تھے کہ سیّدنا ہاجرہؑ خدا کے حکم کی تعمیل میں ملنے والی رحمت کا بخوبی ادراک رکھتی ہیں۔ وہ خود کیا اپنے منہ سے انہیں تسلیاں دیتے۔ فرشتے آ آ کر سیّدہ ہاجرہؑ کو خوشخبریاں دیتے۔ ایک رات صحرا بیاباں میں بیوی بچے کے ساتھ رہے، صبح خاموشی سے اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا، ان کے ماتھے چومے اور پلٹ گئے۔

مدتوں سے سیّدنا ابراہیمؑ سفر میں تھے۔

بچپن، لڑکپن اور جوانی ایران، عراق، اُردن، شام اور مصر میں گزری۔

فوت فلسطین میں ہوئے۔ الخلیل جرون میں مدفون ہوئے۔

کہتے ہیں کرہ ارض پر ایک علاقہ تہذیب کے اوّلین مراکز میں سے تھا۔ وہ تھا، دجلہ اور فرات کے درمیان کا سات سو میل لمبا ہرا بھرا زرخیز علاقہ۔ اس خطے کے جنوبی علاقے کلدانی میں شہر ''اُور'' تھا۔ خوشحال لوگوں کا نگینے کی طرح چمکتا دمکتا شہر۔ چاند دیوتا کے مندر تھے وہاں۔ شاہی محلات میں ساگوان کے شہتیروں پہ چاندی اور سونے کے پترے چمکتے تھے۔ سیّدنا ابراہیمؑ عراق کے اُسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد آذر بھی عراق کے تھے۔ نسل در نسل سے وہ عراقی تھے۔ کوفہ کی مضافاتی بستی کوثی نزد بابل میں سیّدنا کا زیادہ وقت گزرا۔ ایک بار

اُدھر قحط آ گیا۔ اُن کا کنبہ ایک سال کے لیے عراق سے نکل کے ایران کے شہر ہرمز گرد گیا۔

وہیں سیّدنا ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی۔

یہ ۲۱۰۰ ق م کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ اُن کے باپ نے سیّدنا ابراہیمؑ کا نام بھی اسی شہر کی نسبت سے ہرمز گرد ہی رکھ دیا۔

کبھی کبھی باپ کا رکھا نام تھوڑی قائم رہتا ہے۔

پیدا ہونے والے بچے کی نسبت میں تو خدا کا دوست اور انبیاء کا باپ ہونا لکھا تھا۔ ان کے بخت میں سیّدنا ابراہیمؑ کے نام سے قائم ہونا رقم تھا۔ ویسے ہی ہوا۔ قحط کے دن ختم ہو گئے۔ ان کا کنبہ عراق میں اپنے آبائی علاقے حران میں واپس آ گیا۔ بابل سلطنت تھی۔ بادشاہ نمرود کہلاتا تھا۔

بت پرستی کا رواج تھا۔

خود سیّدنا ابراہیمؑ کا والد نام کا تارخ اور نسب کا آذر لکڑی کے بت بنا کے روزی کماتا تھا۔ تھا بڑھئی، بت سلیقے سے بناتا۔

ایک زمانہ تھا کہ وہ بت بنا کے اپنے کم عمر بیٹے ابراہیمؑ کو دیتا کہ بیچ آ۔

باپ کا حکم وہ نہ ٹالتے۔

سیّدنا ابراہیمؑ بت بیچنے خوانچہ سر پہ رکھ کے نکل جاتے۔ دل ایک ان دیکھے خدا کو دیکھتا رہتا۔ بازار میں جا کے سیّدنا آواز دیتے۔

”ہے کوئی جو مجھ سے ایسی چیز خریدے جو نہ نفع دے نہ نقصان۔“

سیّدنا ابراہیمؑ سے وہ بت تو نہ بکتے، ان نہ بکتے بتوں کا شہرہ بہت ہوتا۔ ان بتوں کی بادشاہ کے دربار تک رسائی تھی۔ بادشاہ سیّدنا ابراہیمؑ اور ان کے والد کو جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ اچھے اچھے بت بنا کے لانے کی وجہ سے سیّدنا ابراہیمؑ کے والد کو بادشاہ سے انعامات بھی ملتے تھے۔ وہ ان انعامات کو پا کے اپنی خوش بختی کا گمان پالے بیٹھا تھا۔ اس کے خیال میں اس کا نصیب چمک رہا تھا۔ اُسے تھوڑی یہ پتہ تھا کہ نصیب کا چاند گھر کی خوشحالی میں نہیں چمکتا۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں تھی کہ رہتی دنیا تک اُن کے خوش بخت بیٹے کا نام ان کی بت تراشی سے نہیں، بلکہ بت پاشی سے مشہور ہونا ہے۔ وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ جسے قائم رہنا ہو، وہ خدا کے حکم سے قائم رہتا ہے۔ اور جو قائم کر دیا جاتا ہے اس پر قیامت تک درود و سلام بھیجا جاتا ہے۔

بڑے بڑے نصیبوں والے اکثر بدنصیب دور میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔

وہ بھی ایسے ہی کم نصیب دن تھے۔ وہ ایک خدا کو نہ ماننے کا دور تھا۔ لوگ جس کی چمک دمک زیادہ دیکھتے اس کی پرستش شروع کر دیتے۔ جس سے انہیں خوف آتا اس کے آگے ادب سے دُہرے ہو جاتے۔ جس سے فائدے کی توقع ہوتی اس کے آگے جھولی پھیلا دیتے۔ وہ مغالطوں میں زندہ رہنے کے دن تھے۔

وہ مغالطے اور وہ دن آج تک زندہ ہیں۔
سیّدنا ابراھیمؑ تھے تو بت بنانے والے کے بیٹے مگر تھے ایک خدائے واحد کے پرستار۔
کسی کو سمجھ نہ آتی کہ جو بات باپ نہیں بتاتا، وہ بیٹا کیسے جان لیتا ہے؟ کیسے سیکھ جاتا ہے؟
کیسے کہہ دیتا ہے؟
بچپن ہی سے سیّدنا ابراھیمؑ کے دل و دماغ، خدائے واحد کے الوہی نور سے بھیگے ہوئے تھے۔ کہنے کو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پندرہ برس تک اوائل عمری، ان کی ایک غار میں گزری۔ ان کے والدین کو خوف تھا کہ بادشاہ وقت، نمرود ان کے بیٹے کو قتل نہ کروا دے۔ فرعون اور موسیٰؑ کی کہانی کی طرح یہاں بھی کہاوت بتائی گئی ہے کہ نمرود کو اس کے جوتشیوں نے ایک ایسے بچے سے ڈرایا تھا جسے ابھی پیدا ہونا تھا۔ فلاں وقت اور فلاں جگہ پر پیدا ہونے والا بچہ تجھے رُسوا کرے گا۔ کہتے ہیں نمرود نے بچے مارنے شروع کر دیئے۔ سیّدنا ابراھیمؑ کی والدہ جنگل میں ابراھیمؑ کو جنم دے آئیں۔ ماں چوری چوری جا کے کھلاتی پلاتیں۔
شاید اس میں خدا کی کوئی حکمت ہو،
کوئی رمز ہو، کوئی راز ہو۔
خدا نے جسے اپنی خدائی میں سے چن کے دوست بنانا ہو وہ اُسے مٹی، پتھر یا لکڑی کے خدا بنانے والے کے رزق سے نہیں پالتا۔
سیّدنا ابراھیمؑ جنگل کی پاکیزہ اور معصوم فضا میں اپنا انگوٹھا چوستے چوستے پندرہ برس کے ہو گئے۔
جب اپنے گھر آئے تو گھر میں بت بنتے اور بکتے دیکھے۔ وہ جانتے تو سب کچھ تھے مگر ان کے بتانے کا طریقہ الگ تھا۔ وہ بتوں کے خریدار، بت پرستوں سے اُن کے خداؤں کا اتا پتا پوچھنے لگتے۔
کوئی دُور چمکتے ستارے کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا دیکھ، کیسا چمک رہا ہے۔
یہ میرا خدا ہے۔
سیّدنا ابراھیمؑ اسے روکے رکھتے۔ تھوڑی دیر میں چاند نکل آتا۔ پھر وہ اُفق کی سیڑھیاں چڑھ کے دھیرے دھیرے اوپر آ جاتا۔
آسمان کی وسعت میں اس کی دودھیا چاندنی کی چادر تن جاتی۔ کچھ دیر پہلے چمکتے ہوئے ستارے کی روشنی چاند کی چاندنی میں ماند پڑ جاتی۔ سارے تارے ایک چاند کی چمکتی چاندنی کی چادر سے پھسل جاتے۔
جیسے چاند کی چاندی نے آسمان کی سلیٹ پہ ہاتھ مار کے اُن ستاروں کو مٹا دیا ہو۔
سیّدنا ابراھیمؑ مسکرا کے ستارے کو خدا سمجھنے والے بت پرست کو دیکھتے اور کہتے اب تیرے ستارے سے بڑا چمکنے والا چاند آ گیا ہے۔ اِسے خدا مان لیں؟
ستارے کا پرستار کھسیانا ہو جاتا اور ستاروں کو چھوڑ کے چاند کی پوجا کرنے لگتا۔
رات رات بھر وہاں پوجا پاٹ ہوتی رہتی۔

سیّدنا ابراھیمؑ کبھی کبھی ایسی راتوں کی سحر دیکھنے رُکے رہتے۔ جب صبح کی سفیدی رات کا سینہ چیر کے روشنی کا بھبکا چھوڑتی اور ایکا ایکی میں سورج آگ بگولا ہوا سر اُٹھا کے کھڑا ہو جاتا تو چاند جہاں ہوتا وہیں دُبک جاتا۔ سیّدنا ابراھیمؑ رات بھر چاند کی آرتی اُتارنے والے پجاری کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لاتے اور سورج کے سامنے کھڑا کر کے پوچھتے:

اب بول تیرے چاند سے بڑا تو یہ ہے۔ اب کیا اِسے پوجو گے؟

پجاری بے دلیل تو ہو جاتا، مگر جنہیں ایک سے زیادہ خداؤں کو پوجنے کی عادت ہوتی ہے انہیں چاند کے بعد سورج کی پوجا سے کیا خوف آنا تھا۔ وہ سر جھکا کے ہاتھ جوڑ کے سورج کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتے۔ شام سے پھر کہیں سے سیّدنا ابراھیمؑ سورج کو پوجنے والوں کے پاس آجاتے اور مسکراتے ہوتے کہنے لگتے،

دیکھتے رہنا، تمہارا خدا ڈوب نہ جائے۔

غروب نہ ہو جائے۔

اُسے پکڑ لو

یہ دیکھو،

یہ پگھلے جا رہا ہے۔ کھسک رہا ہے۔

اس سے اِس کی دھوپ نکل گئی۔ لالی رہ گئی۔

لو یہ بھی گئی۔ سارا سورج ایک بے حدت سا گولا بنا مغرب میں ڈوب گیا ہے۔

مر گیا ہے۔

اب اندھیرا منہ کھول کے اسے نگل لے گا۔

لو ہو گیا اندھیرا، کدھر گیا تمہارا سورج دیوتا؟

کیا اُسے پوجتے ہو جس کے نصیب میں غروب ہونا لکھا ہو؟

کیا اس سے زندگی مانگتے ہو، جو روز شام کو مر جاتا ہے؟

پوجا پاٹ کے لوگ بے دلیل ہو گئے۔

بے دلیلوں کے پاس صرف غصہ ہوتا ہے۔

بے سمت، اندھا اور بدنما غصہ۔

وہ اپنے خداؤں کی تذلیل سن سن کے بیچ وتاب کھاتے رہتے۔ سیّدنا ابراھیمؑ انہیں خدائے واحد پہ ایمان لانے کا کہتے مگر ان بے حساب خداؤں کا حساب رکھنے والے لوگوں کے ذہن میں ایک خدا کا تصور ہی نہ اُبھرتا۔ الٹا وہ اسے اپنی توہین سمجھتے۔ شاید مادی دنیا کے نظریوں کی طرح ان کے خیال میں بے شمار خداؤں کے مقابلے میں ایک خدا کا تصور انہیں غریبانہ لگتا تھا۔ وہ کئی کئی عورتوں، کئی کئی کمروں کے گھروں کے مالک خوشحال لوگ تھے۔ شاید وہ سوچتے ہوں، ہمارے پاس اتنی بہتات ہے، پھر کیسے پوجا پاٹ کے لیے صرف ایک خدا چن لیں۔ وہ غصے سے سیّدنا ابراھیمؑ کو گھورتے رہتے۔ ان کے والد سے شکایت کرتے۔ ان کے ابا انہیں ڈانٹتے، کہتے دیکھ انہیں مت ستا، ان کی بات مان لے، ورنہ یہ تجھے ماریں گے اور میں بچا نہ پاؤں گا۔ سیّدنا ابراھیمؑ دل ہی

دل میں مسکراتے - شاید سیّدنا سوچتے ہوں کہ ابا کو نہ مارنے والے کی سمجھ ہے نہ بچانے والے کی۔

کئی بار سیّدنا ابراھیمؑ نے کوشش کی، کہ اپنے ابا کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔ بڑی دلیلیں دیں، منتیں کیں، مگر وہ نہ مانے۔

جب تک کسی کے نصیب میں خدا خود اپنی پہچان نہ لکھے،

اس سے خدا تھوڑی پہچانا جاتا ہے۔

سیّدنا ابراھیمؑ کے والد بھی، خدائے واحد کو نہ پہچان سکے۔ الٹا بت پر بت بناتے رہتے۔ ان کے بنائے بتوں سے بادشاہ کے دربار کا بڑا بت خانہ بھر گیا۔ بت خانے میں ہر سمے لوگوں کا انبوہ رہتا تھا۔ ایک بار اس مندر سے باہر ایک میدان میں بڑا سا میلا لگا۔ لوگ ادھر امنڈ پڑے۔

مندر کا پروہت اور سیّدنا ابراھیمؑ کے والد آذر بھی میلا دیکھنے نکل گئے۔ سیّدنا ابراھیمؑ کے ہم جولیوں نے انہیں بھی میلے پہ چلنے کا کہا۔ ان کی طبیعت بتوں کی بہتات نے بوجھل کی ہوئی تھی۔ پوری بات انہیں کھول کر کیا کہتے۔ جان چھڑانے کے لیے اتنا کہنا کافی تھا، جاؤ تم لوگ میلا دیکھو، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ طبیعت ٹھیک کیسے رہتی، جب ان کے باپ کے بنائے بتوں کا مندر میں ہجوم کھڑا تھا، اور ان کے دل و دماغ پہ ایک خدائے واحد کی مقدس روشنی نے ہل چل مچائی ہوئی تھی۔ سب لوگ سیّدنا ابراھیمؑ کو چھوڑ کے چلے گئے۔

سارا مندر سونا رہ گیا۔

اندر بت ہی بت

کوئی بڑا کوئی چھوٹا۔

سیّدنا ابراھیمؑ شاید اسی تاڑ میں تھے۔

انہوں نے میلے ٹھیلے سے کیا لینا تھا۔ ایک کلہاڑا کہیں قریب سے مل گیا۔ سیدھے مندر کے اندر گئے۔ اندر بے جان، بے زبان لکڑی، مٹی، پتھر سے تراشے ہوئے بت سہمے کھڑے تھے۔ سیّدنا ابراھیمؑ نے کلہاڑے مار مار کے سارے بتوں کے حلیے بگاڑ دیئے۔ کسی کی ٹانگ کٹ کے نیچے گر گئی۔ کسی کا بازو کندھے سے لٹک کے سینے پہ جھولنے لگا۔ کسی کے شکتی دینے والے ہاتھ ساری انگلیوں سمیت کلائی سے کٹ گئے۔ کچھ کی گردن کے پیچھے وار ہوا تو بت کے چہرے کی تھوڑی سینے پہ لٹکنے لگی۔ کچھ کی گردنیں کٹ کے نیچے گر پڑیں۔ وہ بت خانہ جہاں تھوڑی دیر پہلے بتوں کی پوری منڈلی کھڑی کوئی خوفناک منصوبہ بندی کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی، ایکا ایکی میں مقتل خانہ بن گئی۔ سارا بت خانہ بتوں کے ٹوٹے ٹکڑوں سے اٹ گیا۔ سیّدنا ابراھیمؑ نے کوئی بت سلامت نہ چھوڑا سوائے ایک کے۔ کسی کا ماتھا پھوڑ دیا کسی کا پیٹ پھاڑ دیا۔ بس ایک بڑا سا بت، جو شاید سارے پنڈال میں اونچے لمبے قد کاٹھ کے لحاظ سے بتوں کی منڈلی کا سردار لگتا تھا، اسے نہ گھائل

کیا۔ کلہاڑا لا کے اس کے کندھے پہ رکھ دیا اور ہاتھ جھاڑ کے بت خانے سے باہر چلے گئے۔ شاید بتانا یہ تھا کہ اگر ایک سے زیادہ خدا کہیں اکٹھے ہو جائیں تو پھر جیت صرف ایک، سب سے بڑے کی ہوتی ہے۔

میلا دیکھ کے بت پرست بت خانے میں آئے تو ان کی آنکھیں ابل کے ان کے چہروں سے باہر آ گئی۔ منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ان کے حلق بے آواز ہو گئے۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔

ان کے خدا ان کے پیروں میں ٹوٹے ادھڑے کٹے پڑے تھے۔ ایسے گھائل اور شکستہ جیسے کسی جنگ میں لٹی پٹی سینا آخری سانس لے رہی ہو۔

بت پرستوں کے سامنے ان کے خدا مر رہے تھے۔

صرف ایک اونچا بت سلامت تھا۔ اسی کے کندھے پر کلہاڑا جھول رہا تھا۔

یہ کس کی شرارت ہے؟

آذر نے بت خانے میں آتے ہی اونچی آواز میں پوچھا

اور کون ہونا ہے، تیرا اپنا ہی بیٹا ہے۔

ہاں وہی ہے، ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہنے والا۔

اس بار اسے نہیں چھوڑنا۔

دیکھو ہمارے خداؤں کا کیا حال کیا ہے!

کتنی بے دردی سے مارا ہے تیرے بیٹے نے ہمارے خداؤں کو۔

میرے بھی تو یہ خدا ہیں۔

ہم نہیں چھوڑیں گے اسے

نہ چھوڑو، میرے تو ہاتھ کے بنے بت اس نے توڑے ہیں، تم اسے توڑ دو۔

نہ اسے یوں توڑ کے آسان موت نہیں مارنا۔

چلو بادشاہ کے پاس

پتہ نہیں، وہ لوگ بادشاہ کے پاس اکٹھے ہو کے گئے یا ایک ایک کر کے۔ شاید بادشاہ بھی وہ تماشہ دیکھنے اُدھر آ گیا ہو۔ بہر حال وہ لوگ سیّدنا ابراھیمؑ کو پکڑ کے لے آئے۔ بت خانے کے اندر کٹے پھٹے، ٹوٹے فیتی فیتی ہوئے بتوں کو دکھا کے پوچھنے لگے۔

بولو، یہ حال تم نے کیا ہے ان کا؟

سیّدنا مسکرائے۔ کہنے لگے، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟

اور کس سے پوچھیں؟ ان کا خون کھول رہا تھا۔

وہ دیکھیں وہ سامنے تمہارے خداؤں کی منڈلی میں سب سے بڑا بت سالم کھڑا ہے، کلہاڑا اُسی کے کندھے پہ جھول رہا ہے۔ جا کے اس سے پوچھو۔ پوچھو تو سہی اس سے (سیّدنا ابراھیمؑ شاید یہ کہتے ہوئے اپنی مسکراہٹ نہ روک سکے ہوں) کیا پتہ اسی کلہاڑے سے ان کی یہ درگت بنی ہو؟

بنی تو اسی کلہاڑے سے تھی درگت۔ مگر اُس لمحے بت پرست سیّدنا ابراھیمؑ کا سوال سن کے لاجواب ہو گئے۔

بولے، تو کمال کی بات کرتا ہے۔ یہ کوئی بول

تھوڑی سکتا ہے۔
پھر تم لوگ آ آ کر اس سے کیا سنتے ہو؟
ہم تو اپنا دکھڑا اسے سناتے ہیں۔
تو اس نے اپنے ساتھی زخمی خداؤں کی چیخ ویکار بھی تو سنی ہوگی؟
دیکھی ہوگی۔
تم مذاق اڑاتے ہو اب۔ ایک ہمارے خداؤں کی ہڈیاں توڑ دیں، ہاتھ پیر کاٹ دیئے۔ پیٹ کھول دیئے۔ اوپر سے ہنسی اڑاتا ہے۔
ہاں، ہنسی آتی ہے (شاید سیدنا ابراہیمؑ ہنسے بھی ہوں)۔ کہنے لگے سوچتا ہوں تم لوگ کیوں اپنی ہنسی اڑواتے ہو۔ انسان ہو کے بے جان، اپنے ہاتھوں کے بنائے لاچار بتوں کو خدا مانتے ہو۔ جس نے تمہیں بنایا ہے، جو اصل خدا ہے۔ اکیلا خدا، واحد، اس کے منکر ہو۔ کچھ عقل سے کام لو۔
اُدھر عقل کہاں تھی۔
عقل جہاں نہ ہو، وہاں صرف غصے کا بھوت رہ جاتا ہے۔ وہ سارے بھوتنے بنے اچھلنے لگے۔
ہم تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔
تم نے ہمارے خداؤں کا قتل عام کیا ہے۔
ہم تمہاری جان لیں گے۔
مگر آسانی سے نکالی جانے والی جان نہیں۔
بہت خوفناک موت ماریں گے۔
ایسی سزا دیں گے، جو آنے والے سارے زمانے یاد رکھیں۔

اُنہیں یہ تھوڑی پتہ تھا کہ، یاد رہ جانے والی چیز بت پرستوں کے ہاتھوں ملی موت نہیں ہوتی۔ خدائے واحد کا یک سُو ہو جانے کا انعام ہوتا ہے۔
وہ سارے بت پرست مشتعل تھے۔
نمرود پہلے ہی کہانی سن چکا تھا۔
اپنے مشیروں کا جمگھٹا لگا کے تدبیر کرنے لگا کہ کیسی سزا دوں جو زمانہ یاد رکھے۔
آگ میں زندہ جلاؤ
تھوڑی سے آگ نہیں
پھر
چار کھیت جتنے احاطے پہ آگ ہی آگ
کئی دن تک آگ دہکے۔
دور شہروں سے بھی لوگ آ کے یہ تماشہ دیکھیں۔ تا کہ آئندہ کسی کو ہمارے خداؤں سے ایسا کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔
اتنی بڑی آگ کے الاؤ میں گرائیں گے کیسے؟
ایک بڑا سا جھولا بنا لو۔ اونچے بانس گاڑھ کے، اس کے اندر اسے باندھ کے عین وسطی آگ کے قلب میں پھینکو۔
یہ صحیح ہے۔ نمرود کو منصوبہ پسند آ گیا۔ حکم دے دیا گیا۔
آگ جلاتے جاؤ۔
لکڑیاں اکٹھی کر کر کے لاتے جاؤ۔
قرب و جوار کے جنگل کاٹ کاٹ کے انہوں نے ایک میدان لکڑیوں سے بھر لیا۔
سارے میدان میں آگ دہکنے لگی۔ کئی

دنوں تک الاؤ ایسا جلایا گیا کہ میلوں تک اس کی تپش جاتی۔ الاؤ کے آس پاس کوئی پرندہ بھی پر مارنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی بھولا بھٹکا بدحواس پرندہ الاؤ کی طرف اڑتا نکل آتا تو، اڑتا اڑتا آگ کی حدت سے جل بھن کے کباب بن جاتا۔ اس کے پر چرچر کر کے جلنے لگتے اور وہ کٹے پروں والے پرندے کی طرح قلابازیاں کھاتا آگ کے سمندر میں آ گرتا۔ اس کا وجود بھی آگ کا شعلہ بن جاتا۔

لوگ تماشا دیکھنے اکٹھے ہو گئے۔

لوگوں کی سب سے بڑی تفریح ہمیشہ تماش بینی رہی ہے۔

بادشاہ اور پرجا کے لیے وہ دیکھنے میں دیدنی نظارا تھا۔

پھر وہ لمحہ آ گیا جب سیّدنا ابرھیمؑ کو دور سے اچھال کے آگ کے سمندر میں پھینکا جانا تھا۔ بت پرستوں کے چہروں پہ انتقام کی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ وہ سیّدنا ابراھیمؑ کا چہرہ دیکھ کے حیران ہوتے۔

سیّدنا ابراھیمؑ کے چہرے پہ اطمینان اور سکون کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

کہتے ہیں آسمان پہ خدا بھی فرشتوں کے منڈلی لگائے سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دوست کو وہ لوگ باندھ کے آگ میں جلانے کا تہیہ کیے بیٹھے ہوں وہ کچھ نہ کرے۔ وہ جس کے حکم کے بغیر آگ جلانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ ہوا جس کے حکم سے چلتی ہے۔ پانی جس سے پوچھ کے سمندر سے بخارات بن کے اُبھرتا ہے، آسمان کی طرف اٹھتا ہے۔ پھر بادلوں کو بوجھل بنائے ہوا کی پشت پہ سوار وہاں تک اڑا لے جاتا ہے، جہاں اُسے برسنے کی اجازت ملی ہو۔ کائنات کا اک اک ذرہ، ذرے ذرے سے بنی مجی، پھولوں کے باغوں والی یہ ساری دنیا صرف اسی خدائے واحد کی فرماں بردار ہے جو اس کا واحد خالق ہے۔

کائنات کی لکھی ڈائری میں وہ عجب لمحہ تھا۔

کائنات بنانے والے کے چہیتے دوست پہ کم عقل لوگوں نے یلغار کی ہوئی تھی۔ آگ کا الاؤ جلا کے سیّدنا ابرھیمؑ کو جلانے کا ارادہ باندھا ہوا تھا۔ یہ سوچے بغیر، یہ سمجھے بغیر کہ جسے وہ آگ میں گرانے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں، وہ نام کس خدائے واحد کا لیتا ہے۔

اپنے خدائے واحد کی وہ نشانیاں کیا بتا تا آیا ہے۔

کیا اس کا خدا اتنا کمزور ہوگا کہ اپنے دوست کو بچا بھی نہ پائے۔

انہیں جب خدا کا ہی شعور نہیں تھا، پھر کیسے انہیں خدا سے دوستی کے تقاضوں کا علم ہوتا۔

وہ بے عقل زمانے کا ہجوم تھا۔ جس میں کھڑا ہر ایک کم عقل جلتے الاؤ کا گھیر دیکھ کے اپنے آپ کو کسی بھی خدائے واحد سے زیادہ موثر، قوی اور ذہین سمجھے بیٹھا تھا۔ انہیں تھوڑی پتہ تھا جو ہونے والا تھا۔ ان کا تو یہی خیال تھا

کہ دور سے جب سیّدنا ابراھیمؑ کو آگ کے الاؤ میں پھینکا جائے گا تو چند ساعتوں میں سیّدنا ابراھیمؑ کا پورا وجود دہکتی آگ سے بھسم ہو جائے گا۔ بھسم بھی ایسا کہ پھینکے گئے انسان کا نام و نشان تک نہ بچے گا۔ آگ جلتی رہے گی اور وہ اس کے گرداگرد ناچیں گے۔ اور یوں ہمیشہ کے لئے کسی خدائے واحد کے تصور کو ایسا نابود کر دیں گے کہ پھر کبھی کوئی اپنی زبان سے ایک خدا کی بات نہ نکالے گا۔

ان کے بت کدے پھر بتوں سے بھر جائیں گے۔

پھر کوئی ان کے بتوں کی گردنوں کو توڑنے والا پیدا نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی آگ کے الاؤ کو دیکھ کے اس میں پھینکے جانے والے گوشت پوست کے زندہ انسان کے بارے میں کم عقل لوگوں کا یہی گمان ہوتا آیا ہے۔ ابھی تک ہے۔

جسے علم نہ ہو کہ کوئی طاقت اور بھی ہے جو اُس کے ارادے سے بڑی ہے، وہ تو اپنے ارادے کو ہی خدا سمجھے گا۔ الاؤ کے گرداگرد بادشاہ سمیت سارے لوگ سیّدنا ابراھیمؑ کو آگ میں بھسم ہوتے دیکھنے کی لذت پالے بیٹھے تھے۔

ہوا کچھ اور ہی۔

اُدھر سیّدنا ابراھیمؑ کو باندھ کے آگ کے الاؤ میں پھینکنے کا سے آیا تو بھاگم بھاگ خدا کے ایک برگزیدہ فرشتے نے سیّدنا ابراھیمؑ کے کان میں آ کے کہا، آپ کہیں تو ابھی ساری آگ بجھا دوں؟

سیّدنا ابراھیم برگزیدہ فرشتے کی محبت بھری بات سن کے مسکرائے اور بولے، جو تیرا اور میرا خدا ہے، یہ آگ کیا اس کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ دیکھنے والا ہے سب اسے نظر آتا ہے۔

تو بھی دُور کھڑا ہو کے دیکھتا جا۔

میں نے کسی بے وفا کمزور سے یارانہ نہیں لگایا۔

وہی بات ہوئی۔

اُدھر نمرود کی فوج نے سیّدنا ابراھیمؑ کو اچھال کے آگ کے الاؤ پہ پھینکا، اسی لمحے خدا نے آگ کو حکم بھیجا۔

''ٹھنڈی ہو جا، سلامتی کی حد تک۔''

آگ ہم انسانوں کی طرح نافرماں بردار تھوڑی ہے۔ اسے تو وہی حکم ماننا ہوتا ہے، جو اسے دیا جائے۔

فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔

آگ پھول بن گئی۔

شعلے گلاب کی پنکھڑیاں بن گئے۔

سینکڑوں فٹ اونچے اُبلتے آگ کے شعلے ایک لمحے کے بھی بیسویں حصے میں ایک دم سے سمٹ کے پھول کی پتیاں بن گئے۔

لاکھوں من جلتی لکڑیوں کا ڈھیر، اگلی ساعت میں گلزار ہو گیا۔ پھول کھل گئے، خوشبو پھیل گئی۔ پھولوں کے خوشگوار ڈھیر میں حضرت ابراھیمؑ یوں آسودگی سے جھول

رہے تھے جیسے وہ ان کی اپنے محبوب سے ملنے کی گھڑی ہو اور گرد اگرد پھولوں سے لدا مہکتا عروس محل ہو۔

نمرود اور اس کے ساتھی تماش بین حیران۔

یہ کیا ہوا؟

کیسے ہوا؟

سارا تماشا ان کی آنکھوں سے سامنے ہوا تھا۔ انہیں شک کیا رہتا۔ مگر دل پہ حکومت خدائے واحد کی ہے۔ جب تک خدا کسی کو نوازنے کا ارادہ نہ کرلے، دل میں سچائی کی پیوند کاری نہیں ہوتی ۔ آنکھوں دیکھی حقیقت سے بھی میلے دل میں شک کی چنگاری رکھ دی جاتی ہے، کہ جلتے رہو۔ سلگتے رہو۔ ناپاک رہو۔ نمرود اور اس کی سپاہ بھی میلے من کے بد بخت لوگ تھے۔ جو آگ انہوں نے جلائی تھی وہ ساری ان کے اندر آ آ کر بھڑکنے لگی۔ وہ لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ یہ کوئی بہت بڑا جادوگر ہے۔ بجائے اس کے ، کہ اس کے خدا سے ڈرتے، وہ اس سے ڈرنا شروع ہو گئے، اور بھاگ گئے۔

نمرود، سیّدنا ابراھیمؑ کے پاس آیا۔ کچھ دیر خاموشی اور شرمندگی سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے سیّدنا سے ایک یاد رکھی جانے والی بات کہی۔

بولا، ''ابراھیمؑ، تیرا خدا تجھ پہ کتنا مہربان ہے''

اُسے نظر آ رہا تھا جو ہوا۔ اس نے آگ کا کھیت اگایا تھا۔ اس آگ میں گرائے جانے پہ سیّدنا ابراھیمؑ کو اتنی خراش بھی نہ آئی جو پھولوں کے ڈھیر پہ گرتے سے آجاتی ہے۔ کچھ ہوا تو اتنا ہوا کہ ہاتھ پاؤں کی بندھی رسیاں جل گئیں۔ آگ جو جلائی گئی تھی وہ سلامتی کی حد تک بجھا دی گئی۔ صرف ٹھنڈا ہونے کا حکم آیا ہوتا تو آگ ٹھنڈی ہوتی ہوتی برف بن کے پھر تکلیف کا باعث ہوتی۔ برف سے نیچے بھی نقطہ انجماد گرتا جائے تو ایک سے آتا ہے جب منفی درجے پہ گری کوئی ٹھنڈی شے پھر جلانے لگتی ہے۔

سلامتی کی حد تک کا تعین ضروری تھا،

اسی لیے وہ حکم 'سلامتی کی حد تک سرد ہو جا' ہوا۔

پورے ہجوم میں صرف دو پاک روحیں کھڑی تھیں۔

ان کے دلوں پہ خدا نے خوشبوؤں کی یلغار کی۔ وہ دونوں پکار اٹھے، ابراھیمؑ کا خدا سچا ہے۔ واحد ہے۔ یکتا ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان دو خوش نصیبوں میں ایک سیّدنا ابراھیمؑ کے بھتیجے: حضرت لوطؑ تھے اور دوسری ہستی ان کی چچا زاد سیّدہ سارہؓ تھیں۔ کہتے ہیں اس واقعے کے بعد سیّدہ سارہؓ سے سیّدنا ابراھیمؑ کی شادی ہو گئی ۔ اپنی بستی اور علاقے کے لوگوں کے وہ ستائے ہوئے تھے۔ لوگ ان سے سہمے ہوئے تھے۔ آخر انہوں نے اپنے خدا سے سفر کی

اجازت مانگی اور یوں عراق سے نکل کے شام اور فلسطین سے ہوتے ہوئے مصر کے علاقے کی طرف چلے گئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سیّدنا ابراہیمؑ کی سیّدہ سارہؓ سے شادی شام میں ہوئی تھی۔ شادی کے وقت سیّدنا ابراہیمؑ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اپنی زوجہ کے ساتھ سیّدنا ابراہیمؑ بہت گھومے۔ اردن بھی گئے۔ آبائی شہر حران بھی جاتے رہے۔ فلسطین میں بہت عرصہ گزارا۔ وہاں ان کا قیام ایلیا میں رہا۔ وہیں بیرسبع نام کا کنواں کھدوایا اور عبادت گاہ تعمیر کی۔ سیّدنا ابراہیمؑ دراز قد مضبوط جسم، خوش طبع شخصیت کے مالک تھے۔ مہمان نواز تھے۔ گوشت کے شوربے میں روٹیاں بھگو کے ثرید بنا کے کھلایا کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے۔ ایک بار تین سو غلام تھے ان کے پاس۔ خدا نے دوستی کا عندیہ دیا تو سارے آزاد کر دیے۔ ایک رات صبح تک اللہ کی یاد میں جاگتے رہے صبح ان کے سر کے دو تہائی بال سفید ہو گئے۔ اللہ سے عرض کی، یہ کیا!

آواز آئی، یہ سفید بال دنیا میں عزت اور آخرت میں نور ہیں۔

نمرود کی بستی سے نکل کے وہ فرعون کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

ان دنوں کا فرعون بھی ہر دور کے فرعون کی طرح بدراہ تھا۔

وہ مسافرت پہ نکلے قافلوں میں سے حسین عورتوں کو اٹھوا کے اپنے حرم میں لے جاتا تھا اور ان کے خاوندوں کو مار دیتا تھا۔

سیّدنا ابراہیمؑ جب آگ کے جلتے میلوں الاؤ سے نہ ڈرے تھے تو انہوں نے ایک بدراہ فرعون کے ارادے سے کیا ڈرنا تھا۔ لیکن وہ خدائے واحد جو میلے غلیظ جوہڑوں میں کنول کے پھول کھلاتا ہے، وہ کوئی اور ارادہ باندھے ہوا تھا۔ سیّدنا ابراہیمؑ جانتے تھے کہ ان کی نیک اور پاوتر زوجہ سیّدہ سارہؓ کو خدا نے بے مثل حسن سے نوازہ ہوا ہے۔ قافلے سے اتار کے فرعون کے کارندے انہیں لے گئے۔

فرعون نے سیّدہ سارہؓ کے حضور گستاخی کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا، تو اس کا پورا بازو شل ہو کے کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح لٹک گیا۔ وہ سمجھ گیا۔

اس کا سامنا کسی بزرگ ہستی سے ہے۔ سیّدہ سارہؓ کے پیروں میں ماتھا رگڑ کے التجا کرنے لگا، میں معافی مانگتا ہوں آپ سے اور اپنے ارادے سے باز آیا، میرے حق میں دعا کر دو کہ میرا بازو پھر سے زندہ ہو جائے۔ سیّدہ سارہؓ نے دعا کر دی۔ فرعون کا بازو ہرا ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے آپ کی نسبت بُرا ارادہ باندھا۔ سیّدہ سارہؓ سے اسے سیّدنا ابراہیمؑ کا بھی علم ہوا، کہ وہ کس قدر عالی مقام اور اونچی شان والے ہیں۔

فرعون کہنے لگا، میں آپ دونوں عظیم ہستیوں کی خدمت کے لیے اپنی ایک عزیز ہستی نذر کرتا ہوں، اسے قبول فرمائیں۔ یہ میری بیٹی ہاجرہؑ ہے مگر آپ کی کنیز بن کے رہے گی۔

سیّدہ سارہؑ، بی بی ہاجرہؑ کو لے کر عزت آبرو اور وقار کے ساتھ سیّدنا ابراہیمؑ کے پاس آ گئیں اور بی بی ہاجرہ کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔

سیّدہ سارہؑ اس وقت تک بے اولاد تھیں۔ ان کے بطن سے سیّدنا اسحاقؑ کے پیدا ہونے میں ابھی دس سال باقی تھے، جب اللہ نے بی بی ہاجرہؑ کی گود ہری کر دی۔ اللہ نے فرعون کے گھر سے اس کی بیٹی لے کر اسے سیّدنا ابراہیمؑ کی مانگی ہوئی کسی دعا کی تعبیر کے لیے چن لیا۔ حالات ایسے بنا دیے گئے کہ سیّدہ سارہؑ نے خود سیّدنا ابراہیمؑ سے مطالبہ کر دیا کہ ہاجرہؑ اور اس کے مولود بیٹے کو دور لے جا کے چھوڑ آؤ۔ سیّدنا ابراہیمؑ کو بھی شاید یہ تقاضہ عجیب لگا ہو، مگر جس ایک رب کے لئے وہ یکسو ہو کے جی رہے تھے، اسی نے ان کے کان میں مسکرا کے ہاں کہہ دی ہوگی۔ سیّدنا ابراہیمؑ بی بی ہاجرہؑ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیلؑ کو سفر پر لے کر چل پڑے۔

سفر خدا کا سوچا ہوا تھا۔

اس سفر کی منزل بھی۔

جہاں خدا نے اس دنیا کے قلب میں اپنے گھر کا نقشہ، اپنے عرش کے عین نیچے طے کیا ہوا تھا۔ وہیں لا کے صحرا اور خشک پہاڑوں بیچ چلے آتے سیّدنا ابراہیمؑ اور ان کی زوجہ بی بی ہاجرہؑ کو گود میں لئے سیّدنا اسماعیلؑ سمیت روک لیا۔

اب اس بے آب و گیاہ ویرانے میں خدا نے دو کام اہم کرنے تھے۔

ایک تو ان باپ بیٹا سے اپنا گھر بنوانا تھا جس کی طرف چہار اطراف سے تھکی ہوئی، پچکے پیٹ والی اونٹنیوں کے سوار اس کے گھر کا طواف کرنے آتے۔ دوسرا یہ کہ سیّدنا ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت کے لیے ان کے فرزند اسماعیلؑ کی پشت سے تمام انبیاء کے سالار، اپنے لاڈلے آخری رسول حضرت محمدؐ کو اپنے گھر کے پڑوس میں پیدا کر کے بڑا کرنا اور ان کے وسیلے سے اپنے گھر کی پہچان ہمیشہ کے لئے قائم کرنا تھی۔

خدا اپنے ارادوں کی تکمیل کرتا ہے۔

سیّدنا ابراہیمؑ بھی جانتے تھے، خدا اپنے ارادے پورے کرتا ہے۔ ان کی دعاؤں کو رد نہیں کرتا۔ انہوں نے بی بی ہاجرہؑ اور شیر خوار بچے کو بے آب و گیاہ وادی بکہ میں خدا کے سہارے چھوڑا اور چالیس دن کی مسافت کی دوری پہ واپس سیّدہ سارہؑ کی طرف لوٹ گئے۔

بی بی ہاجرہؑ اور شیر خوار سیّدنا اسماعیلؑ کے لئے چاروں طرف ہیبت سے کھڑے پہاڑوں بیچ گرم ریگزار صحرا میں ایک بوند

بھی پانی نہ تھا۔ اوپر دھوپ سے بھرا آسمان آگ برسا رہا تھا۔ اپنے بنائے جانے والے گھر کے احاطے میں خدا نے جس مقدس پانی کا چشمہ سوچا ہوا تھا، اسے اب ممتا کی مقدس محبت بھری لگن اور معصوم شیر خوار پیاسی ایڑھیوں کے تذبذب سے پیدا ہونا تھا۔

سیدنا ابراہیمؑ اپنی اونٹنی پہ سوار صحرا بیچ چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سورج سرکتا سرکتا عین سر پہ آ گیا۔ ساتھ لایا زادِ راہ ختم ہو گیا تھا۔

پیاسی ممتا کو اپنی پیاس سے کہیں زیادہ شیر خوار بچے کی پیاس کا خوف تھا۔

وہ سسکتی ہرنی کی طرح گھبرائی ہوئی دوڑتی پھرنے لگیں۔

خدا کا امن دینے والا گھر تو ابھی بننا تھا۔ مگر اس برگزیدہ گھر کے پڑوس میں کھڑی خدا کی مقدس نشانیاں: صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اس دن بھی دھوپ میں باادب کھڑی تھیں۔

بی بی ہاجرہ اپنے بچے کو خدا کے سوچے ہوئے اس کے محترم گھر کے سامنے ریت پہ لٹا کے، پانی ڈھونڈتی ہوئی قریب کی پہاڑیوں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے لگیں۔ دوڑتے دوڑتے وہ چہار اطراف پانی تلاش کرتیں۔ ایک نظر لیٹے ہوئے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو دیکھتیں۔ مبادہ کوئی جنگلی جانور نہ اُدھر حملہ آور ہو جائے۔ روتا روتا پیاسا شیر خوار بے دم نہ ہو جائے۔ دونوں پہاڑیوں کی گود میں ایک گہری جگہ پہ دوڑتے ہوئے کچھ دیر کے لئے سیّدہ ہاجرہؑ کو ان کا بیٹا نظر نہ آتا تو وہ اپنی رفتار بڑھا دیتیں۔ تیز دوڑنے لگتیں، تاکہ جلدی سے اگلی پہاڑی پہ چڑھ کے اپنے بیٹے کو دیکھ لیں۔ بس صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا کے درمیان سات بار وہ بھاگی تھیں۔ صفا سے بھاگنا شروع کیا تھا۔ ساتواں چکر مروہ پہ ختم ہی ہوا تھا کہ دیکھا، لیٹا ہوا شیر خوار بچہ جہاں ریت میں ایڑھیاں مار رہا تھا، وہیں سے شفاف اجلے پانی کی پھوار اُچھل رہی ہے۔

سیّدہ ہاجرہؑ خوشی سے نہال ہو گئیں۔

آسمان سے اترے ایک فرشتے کی آواز بھی آ گئی۔

جاؤ تمہاری دُعا سنی گئی، تلاش پوری ہوئی۔

پانی پہنچ گیا۔

چشمہ قائم ہوا اور تمہارا ان پہاڑیوں بیچ بھاگنا بھی۔

سیّدہ ہاجرہؑ بجلی کی طرح دوڑتی اپنے بچے کی طرف آئیں۔ ایڑھیوں سے نکلتا پانی ایسے تیزی سے پھیلے جا رہا تھا جیسے فرشتے اس پر، پَر مار رہے ہوں۔ لیٹے بچے کی ایڑھیوں سے نکل کے پھیلتے پانی کو دیکھ کے، پانی سے بولیں: ٹھہر ٹھہر..... زم زم۔

نکلتا ہوا میٹھے خوشگوار پانی کا چشمہ قیامت تک لئے وہیں ٹھہر گیا۔ جس کے نصیب میں پیاسی روحوں کی پیاس بجھانا لکھ دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

''برگد کی موت''

میرا آبائی گاؤں راجن پور سے تیس بتیس میل کے فاصلے پر ہے لیکن میرا زیادہ وقت لاہور میں گزرا۔ میری ماما لاہور کی تھیں ان کا گاؤں میں کبھی دل نہ لگا۔ اس لیے ہم چاروں بہن بھائی اور ماما چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لیے گاؤں جاتے تھے۔

میرے بابا راجن پور کے بڑے زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ میرے نانا بھی زمیندار تھے اور اچھے خاصے خوشحال تھے پر میرے بابا سے زیادہ مربعوں کے مالک نہیں تھے۔

راجن پور میں بھی ایک حویلی تھی، ہم جب جاتے تھے تو ایک آدھ دن راجن پور رکتے پھر بابا ہمیں گاؤں لے جاتے تھے۔ ہمیں بھی زیادہ مزہ گاؤں میں ہی آتا تھا۔

مرد حضرات تعلیم یافتہ تھے اور خواتین چٹی ان پڑھ تھیں۔ اس لیے وہاں پر ایک سے زائد شادیوں کا رواج تھا۔ ایک خاندانی گاؤں والی بیوی دوسری شہری پڑھی لکھی بیوی۔

میری ماما بی اے فائنل میں تھیں کہ اچانک میرے بابا سے اُن کی شادی ہو گئی۔ دراصل ہمارے کسی رشتہ دار کے ہاں شادی کے موقع پر انھوں نے ماما کو دیکھ لیا اور لٹو ہو گئے اور شادی کے بندھن میں باندھ کر ہی چین لیا۔

ماما نے بہت شور مچایا کہ ابھی تو ان کا بی اے بھی پورا نہیں ہوا وہ ابھی ماسٹر کرنا چاہتی ہیں۔''

میرے بابا نے ماموں اور نانا کو شیشے میں اتار لیا۔ ویسے بھی میرے ماموں اور بابا G - C میں کلاس فیلو اور دوست تھے۔ دونوں نے اکٹھے ہی انگلش لٹریچر میں ماسٹر کیا تھا۔

نانا کو انھوں نے مطمئن کر دیا۔ ''تارا شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہے ان پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔''

میری ماما تین بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھیں۔ جیسے ماما زندگی بھر میکے میں لاڈلی رہیں ویسے ہی بابا نے بھی ان کے لاڈ اور نخرے اٹھائے۔ وہ گاؤں جا کر رہنا نہیں چاہتی تھیں انھوں نے کبھی ماما کو گاؤں جا کر رہنے پر مجبور نہیں کیا۔

شادی کے موقع پر ماما کو طلاق کا حق دیا گیا۔

سیما پیروز

بابا نے یہ بھی لکھ کر دیا کہ اُن کی نہ کوئی پہلی بیوی ہے نہ وہ کبھی دوسری شادی کریں گے۔ سارے خاندان کی لڑکیاں ماما کی قسمت پر رشک کرتی تھیں اگر میری ماما حسین تھیں تو میرے بابا بھی وجاہت اور قد کاٹھ میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ماشاء اللہ جوڑی ہی خوبصورت تھی۔

گاؤں میں ہماری دادی ماں تھیں۔ تایا ان کی آل اولاد دو پھوپھیاں ان کے بچے اور بہت سارے رشتہ دار تھے۔

مجھے اپنا گاؤں جانا اس وقت سے یاد ہے۔ جب میں پانچ برس کی تھی۔ راجن پور کا سفر ہمیں کافی دلچسپ لگتا اور خوب مزہ آتا۔ شاید ماما کو اتنا پسند نہیں تھا۔ لاہور سے ملتان تک بائی ائر جاتے۔ ائرپورٹ پر بابا ہمیں اپنی جیپ پر ڈرائیور کے ساتھ لینے آجاتے۔ ایئرپورٹ پر ہی ماما کالا برقع پہن لیتیں اور چہرہ بھی نقاب سے ڈھانپنا پڑتا۔ جب میں اور میری بہن ذرا بڑے ہوئے تو ہمیں بھی پردہ کرنا پڑا۔ ماما سارا راستہ انگلش میں بڑبڑاتی رہتیں۔

''آپ میری بچیوں کو بھی گنوار بنا دیں گے۔'' میں ماما کا ہاتھ دبا کر انھیں منع کرتی بڑی بہن ماما کی طرف داری کرتی تھی۔

گاؤں میں مجھے جن چیزوں نے متاثر کیا وہ تھیں دادی ماں ان کی حویلی اور بڑے سارے صحن کے درمیان بہت بڑا اور پھیلا ہوا برگد کا درخت تھا۔ اس کے گرد گولائی میں پکی اینٹوں کا دائرہ بنا ہوا تھا۔ دادی ماں برگد کے موٹے سے ڈال کے ساتھ مضبوط رسی کی پینگ ڈلوا دیتی تھیں۔ دوپہر میں میرے سارے کزنز بھی آجاتے۔ ہم گول چبوترے پر بیٹھ کر خوب کھیتے اودھم مچاتے اور پینگ جھولتے تھے۔ صحن کی پچھلی دیوار کے ساتھ آم، لسوڑھے اور کچنار کے درخت تھے موتیا، رات کی رانی، چنبیلی، جھمکا بیل اور ہارسنگھار کے پودے بھی تھے۔ ہارسنگھار کے پودے کو ذرا سا چھونے پر سرخ ڈنڈی اور ہلکے زرد رنگ کے پھولوں کی بارش سی ہونے لگتی۔ سارا سال کسی نہ کسی پھول کی خوشبو سارے صحن میں اُڑتی پھرتی۔ ہم زمین پر گرے ہوئے پھول چن کر انھیں جھولیوں میں بھرتے۔ جھمکا بیل کے سفید اور گلابی پھولوں سے بغیر سوئی دھاگے کے ہار اور کلائی میں پہننے والی پونی بنانا میری پھوپھی زاد بہن نے سکھایا تھا۔

دوپہر میں اکثر ماما کی اچانک آنکھ کھل جاتی تو وہ مجھے بستر پر نہ پا کر چیل کی طرح اڑتی ہوئی آتیں اور مجھے گھسیٹ کر لے جاتیں۔ سارے بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتے۔

مجھے نہلاتے وقت دو چار دھموکے ضرور لگتے تھے۔

''ردا__ تم تو جانور ہی بن جاتی ہو یہاں آکر۔ اَن جاہلوں کے ساتھ مل کر ویسی ہی ہو جاتی ہو۔''

بابا میری جان چھڑاتے۔ کیوں مار رہی __؟ جانے دو بچی ہے۔''

''آپ دیکھ رہے ہیں اس کی حالت!

غضب خدا کا سارا سر مٹی سے اَٹا پڑا ہے۔ اور فراک کی حالت دیکھیں ذرا۔"

"کیا کیا ہے فراک کے ساتھ ___؟ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور میں خاموش رہتی۔ پھر دو تین جھنجھوڑے ملتے۔

"بولتی نہیں ___ نئی فراک کا بیڑہ غرق کر لیا۔ یہ داغ بھی نہیں اتریں گے۔" وہ کافی دیر بڑبڑاتی رہتیں۔

میں بابا کے ساتھ لپٹ کر سو جاتی۔

میرے بابا انتہائی محبت کرنے والے اور پیارے انسان تھے۔ اُن کی عادات واطوار میں وڈیروں والی کوئی بات نہیں تھی۔ بابا ہر دو مہینے کے بعد لاہور آتے اور مہینہ بھر رہ کر جاتے۔ فصل کی کٹائی کے بعد اکثر لمبا عرصہ قیام کرتے۔ ہماری تو عید ہو جاتی۔ گاؤں سے پکی گھانی کا تیل نکلوا کر لاتے اور بڑے پریم سے ہم دونوں بہنوں کے سروں میں لگاتے۔ سردیوں میں انڈے پھینٹ کر گرم دودھ میں ملا کر پلاتے۔ ماما سو رہی ہوتیں تو انھیں کبھی نہ جگاتے۔ اکثر صبح کی چائے خود ہی بنا لیتے۔ ہمارے ملازمین بھی گاؤں سے ہی آتے تھے۔ اُن کا خیال اولاد کی طرح رکھتے۔ پیچھے گاؤں میں ان کے والدین اور بال بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ اپنے گاؤں میں مڈل تک سکول بنوایا۔ زور زبردستی سے مزارعوں کے بچوں کو پڑھاتے۔ قابل لڑکے اور بچیوں کو لاہور لے آتے۔ کہ پڑھ لکھ کر انسان بنیں۔ جاہل گنوار نہ رہیں۔

"یہ کن گنواروں کو اٹھا لائے ہیں۔ یہ کس کام کے ہیں۔ انھیں میں پالوں گی۔ سردار صاحب مجھے مدر ٹریسا بننے کا کوئی شوق نہیں۔ اُن کو ڈرائیور کے ساتھ فوراً روانہ کریں۔"

"غصہ کیوں ہوتی ہو___؟ یہ ہمارے مزارع اللہ وسایا کے بچے ہیں۔ بیچارے بن ماں کے ہیں۔ سارا دن گلیوں میں آوارہ گھومتے ہیں۔ ابھی تو انھیں صرف سگریٹ کی لت ہے وہاں رہے تو چرس، گانجا اور ہیروئن قسم کے نشوں میں پڑ کر زندگی برباد کر لیں گے۔"

"لیں اور سنیں۔ خیر سے نشئی بھی ہیں۔ کم بخت سگریٹ کہاں سے لیتے ہیں۔؟ ماما نے حقارت سے انھیں گھورا۔

"سڑکوں پر گرے ہوئے ٹوٹے اٹھا کر پیتے ہیں۔ یہاں رہے تو انسان بن جائیں گے۔ ثواب کا کام ہے۔"

بابا نے اماں کا دل موم کرنا چاہا۔

"مجھے نہیں ثواب کمانا۔ بس میں نے کہہ دیا یہ یہاں نہیں رہیں گے۔"

ماما نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

"ماں کدھر گئی۔ مر گئی یا بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔" ماما نے طنز کیا

بابا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔"

"اُف خدایا! یہ جاہل عورتیں۔ اُلو کی پٹھیاں۔ انھیں بھاگنے کا کتنا شوق ہے۔ نہ شرم نہ حیا۔ ظالم عورتیں۔ اولاد کو چھوڑتے ہوئے ان

خبیثوں کا دل نہیں دکھتا۔ جو کم بخت آشنا لے کر جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح پھینک کر چلا جاتا ہے۔'' ماما کا غصہ آسمان پر تھا۔

کوٹھی کی بیسمنٹ میں کافی سارے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہمارا چوکیدار اور سارے ملازمین وہیں رہتے تھے۔ بابا اُن کو راشن اور اوپر کے خرچے کے لیے الگ سے رقم دیتے تھے۔ وہ اپنا کھانا بناتے تھے۔

''پلیز تارا_ میری خاطر میں ایک ملازم اور بھیج دیتا ہوں۔ وہ ان کو سنبھالے گا۔ قادر بخش کی ڈیوٹی لگا جاتا ہوں۔ وہ ان کے لیے ایک قاری صاحب اور ماسٹر کا انتظام کر دے گا۔ جب کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ لیں گے تو پھر کسی سرکاری سکول میں داخل کروا دیں گے۔''

''جو آپ کا جی کرے وہ کریں۔ آپ نے کونسا باز آ جانا ہے۔ لیکن ایک بات کہے دیتی ہوں اگر کوٹھی کی طرف کبھی آئے۔ تو اسی دن واپس بھجوا دوں گی۔ غضب خدا کا۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔''

بابا نے ایک زوردار کا قہقہہ لگایا۔

گرمیوں کی تعطیلات میں پندرہ بیس دنوں کے لیے ہم گاؤں جاتے تو میری عید ہو جاتی۔ میرے بہن بھائی ماما کی طرح صاحب لوگ تھے۔ وہ وہاں کے لوگوں سے کم ہی گھلتے ملتے تھے۔ باہر مردانے میں بابا کے پاس بہت سارے لوگ آتے خاص طور پر بھائیوں سے ملنے اندر حویلی میں بابا کی (زال) بیوی اور بیٹیوں سے ملنے والیوں کا تانتا بندھ جاتا۔ وہ سب ماما سے ہاتھ ملاتیں اور پیروں کو ہاتھ لگاتیں جو ماما کو کافی ناگوار گزرتا۔ اُن عورتوں کے ساتھ بڑا لیے دیئے کا انداز رکھتیں۔ میری بڑی بہن تو کمرے سے ہی نہیں نکلتی تھی۔ مجھے یہ سب ہنگامہ بہت اچھا لگتا۔

دادی ماں اور بابا مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ بابا کہتے تھے۔ ''میری یہ بیٹی میرے جیسی ہے۔'' برگد کا درخت بچپن سے ہی میری فینٹسی تھا۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی برگد سے میری محبت بڑھتی گئی۔ زنانہ حویلی کا دروازہ عبور کرتے ہی میری ملاقات برگد سے ہوتی۔ مجھے لگتا جیسے وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوا ہے اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا ہے۔

دادی ماں گرمیوں کی ساری دوپہریں اسی کے نیچے گزارتیں۔ اس کی چھاؤں بہت ٹھنڈی اور گھنی تھی۔

برگد کے اوپر اور نیچے ایک جہان آباد تھا۔ اس کی گھنی شاخوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ فاختہ، بلبل، طوطے، چڑیاں، کوے اور گلہریاں ایک ڈال سے دوسری پر بڑے مزے سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہتیں اور دن بھر پھدکتیں رہتیں۔

کھانے کی کوئی چیز دیکھ کر بے تحاشا کوے درخت پر آ بیٹھتے۔ دادی ماں نے ایک ائر گن رکھی ہوئی تھی۔ وہ ہوائی فائر کرتیں تو سارے کوے کاں کاں کرتے اُڑ جاتے۔

کتنے بڑے بڑے فیصلے اسی برگد کے نیچے ہوتے تھے - شادی بیاہ کے معاملات گھروں سے بھاگی ہوئی عورتیں کے آپس کے جھگڑے اور زمینوں کے لین دین سب کا گواہ برگد تھا۔

اس کے علاوہ گندم کی صفائی، چاولوں کو نمک اور ہلدی لگا کر بوریوں میں بھرنا۔ عزیز و اقارب کی لڑکیاں اور کامیاں یہیں بیٹھ کر چرخہ کاتتیں۔ تھک جاتیں تو جھومر ڈالتیں۔ نالے پراندے بناتیں۔ مجھے چٹیا بنا کر پراندہ ڈالنے کا بہت شوق تھا اس کی خاطر میں ماما کے بار بار کہنے پر بال نہیں کٹواتی تھی۔ میرے لیے دادی ماں کالے، سرخ، سبز، پیلے ڈھیر سارے رنگ برنگے پراندے بنوا کر رکھ چھوڑتیں۔ پراندوں کے نیچے پنکھے سے بنے ہوتے تھے کسی میں گولڈن اور کسی میں سلور تلہ لگا ہوتا۔ اور کسی میں جو موتی پروئے ہوتے۔ میں کالج جاتی تو لڑکیاں فرمائش کرتیں ہمیں بھی بنوا کر دو۔ ہر سال دادی ماں بابا کے ہاتھ میرے لیے پراندے رنگین چنگیریں اور خوبصورت پنکھیاں بھجواتی تھیں۔ اس کے علاوہ کھنڈ پیڑے (کھوئے کے پیڑے) اور سوہن حلوہ گڑ میں بنوا کر بھیجتیں۔

چکی پر نمک مرچ اور ہلدی پیسی جاتی۔ صبح سویرے ماسی اللہ وسائی کسی بلوتی تو مدھانی کسی گھر گھر سے میری آنکھ کھل جاتی تو میں باہر آ کر ماسی سے ضد کرتی کہ میں وہی بلوؤں گی۔ پر ایک دو چکروں کے بعد رسی کو بل پڑ جاتا اور مدھانی رک جاتی۔ ماسی اللہ وسائی اور دادی خوب ہنستیں میں خفا ہو کر اُٹھ جاتی۔

دادی ماں ہنستے ہوئے مجھے پیار کرتیں اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتیں اور کہتیں ''ایہہ ویکھ تیرے ہتھ کِڈے ملوک تے سوہنے نیں۔ اے ایہو جئے کم کرن واسطے نئیں۔ توں تے ڈھیر سارا پڑھنا ایں۔ فیر ڈاکٹر بننا ایں۔''۔

''تے فیر جدوں دادی بیمار تھیسی تے میری دھی اپنی دادی دا علاج کریسی۔'' میں اُن سے لپٹ جاتی۔

گرمیوں کا باورچی خانہ بڑے مزے کا تھا۔ اوپر چھت تھی۔ دو طرف دیواریں تھیں۔ عجب کھلا سا باورچی خانہ تھا۔ ٹی سے بنے ہوئے چولہے میں لکڑیاں جلتی تھیں اور مٹی کی ہانڈی میں سالن پکتا تھا۔ صحن کے آخری کونے پر تنور تھا۔ وہاں سے گرم گرم روٹیاں لگ کر آتیں دادی ماں مکھن یا دیسی گھی سے چپڑ کر دیتیں۔ (ماما لوگوں کو دیسی گھی کی (خوشبو) بری لگتی تھی۔ وہ نہیں کھاتے تھے۔ ویسے بھی ہی روٹیاں انہیں موٹی اور سخت لگتی تھیں۔

ماما بابا کو کہتیں تھیں ''یہی موٹی موٹی روٹیاں ٹھونس کر جب لاہور آتے ہیں تو توند باہر نکلی ہوتی ہے۔''

بابا ہنس پڑتے۔

ماما وغیرہ کے لیے دوسرے باورچی خانے میں ان کی پسند کی چیزیں پکتی تھیں۔ وہ ڈائننگ روم میں کھانا کھاتے تھے۔ میں اور بابا دادی کے ہاتھ کی روٹی بہت مزے سے کھاتے۔ اکثر بھنی ہوئی دال اور سبزی وغیرہ روٹی پر رکھ کر کھاتے۔ میرا بہت دل چاہتا کہ میں بھی بابا کی طرح کھاؤں پر ماما کے ڈر کے مارے نہ کھا پاتی۔ کبھی کبھار ماما نہ ہوتیں تو میں بھی بابا کی طرح چنگیر میں روٹی رکھ کر اوپر سالن ڈال کر کھاتی۔ اتنے مزے کی وہ روٹی اور سالن تھا کہ آج تک میں اس کا ذائقہ نہیں بھول پائی۔

دادی ماں بہت خوش ہوتیں۔ ”پتر سیف اللہ تیری یہ دھی میکوں بہوں چنگی لگدی اے۔ شالا حیاتی والی ہووے، نصیبہ نیک ہووے۔“ وہ مجھے دعائیں دیتیں۔ میں اُن کی گود میں منہ چھپا لیتی۔

ہم سب بہن بھائی بڑی کلاسوں میں چلے گئے تھے۔ اس لیے ہمارا جانا کم ہو گیا تھا۔ بھائی دونوں تو مزید پڑھائی کے لیے لندن چلے گئے تھے۔ بڑی بہن ڈاکٹر بن رہی تھی وہ بھی کافی مصروف تھی۔

میں ایف ایس سی کا امتحان دے کر فارغ تھی۔ بابا جان کے ساتھ راجن پور آ گئی۔ دادی ماں پہلے سے کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”مینڈھی دھی۔ میکوں بھل گئی اے۔“

”نہیں دادی ماں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کوئی بھولنے والی ہستی ہیں۔“ میں نے ان کے گال پر پیار کیا۔

”اب سب پڑھائیوں میں مصروف ہیں۔“

”بھائیوں کا کیا حال ہے؟ اتنی دور بھیج دیا ہے۔“

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں ٹیلی فون پر تقریباً روزانہ ہی بات ہوتی ہے۔“

”شالا خیر نال آوَن۔ جوانیاں مانن۔ رب کرے تساں کوتی وانہ لگے۔“

برگد نے بھی حسب معمول مجھے خوش آمدید کہا۔

”دادی ماں یہ تو پہلے سے بھی زیادہ پھیل گیا ہے۔ اب تو اس کی شاخیں پچھلے صحن تک چلی گئی ہیں۔“

”کئی واری چھانگیا اے (شاخیں کاٹا) پر ایہہ فیر ودھ جاندا اے۔“ میں اس بار اکیلی آئی تھی مجھے بہت اچھا اور اوپن فیل لگ رہا تھا۔ ماحول اور انسانوں میں بے ساختگی، سادگی اور اپنائیت تھی۔ اور میرے لیے سب سے حیران کن بابا کا ایسا روپ تھا جو کم از کم ہم سب کی آنکھ سے اوجھل تھا، جو کسی درویش اور صوفی کا روپ تھا۔

صبح نماز کے بعد اذان کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے نماز پڑھی۔ اور دوبارہ لیٹ گئی۔ نماز کے بعد بابا تلاوت کر رہے تھے۔ اُن کی قرأت میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔ میری آنکھوں میں بلاوجہ آنسو آ گئے۔ وہ غالباً تلاوت ختم کر کے باہر دادی کے

پاس چلے گئے تھے۔
تھوڑی دیر کے بعد میں بھی صحن میں آ گئی۔ بابا ناشتہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے "لگتا ہے میری بیٹی کو رات نیند نہیں آئی۔"
"نہیں_ ابا میں بہت مزے سے سوئی اور صبح اذان سے مری آنکھ کھلی۔ بہت لطف آیا۔ کتنا خوش الحان مؤذن ہے۔"
"آؤ_ بتاؤ کیا ناشتہ کرو گی۔؟ انڈا پراٹھا_ یا ڈبل روٹی کھانی ہے۔ چائے دم والی پیو گی۔" دادی نے پیار سے پوچھا۔
"نہیں دادی ماں_ میں بھی بابا والا ناشتہ کروں گی۔"
"نہ میری دھی۔ ایویں بیمار نہ ہو جائیں۔"
"نہیں میں یہی کھاؤں گی۔" میں نے ضد کی۔
"ماں جی_ میری بیٹی کو یہی ناشتہ دیں۔"
دادی ماں نے چنگیر میں رات کی باسی روٹی اور اس پر مکھن رکھ کر چنگیر پر مجھے پکڑا دی اور ساتھ ایک لمبے سے گلاس میں چائی میں سے لسی ڈالی گلاس اور نمک کی ڈلی میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ "اپنی مرضی سے نمک گھول لو۔"
"میں ناشتہ کر رہی تھی تو بابا جان بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہے تھے۔
"کیسا لگا ناشتہ۔؟
بہت مزے کا بابا جان۔ آپ کیا روز یہی کھاتے ہیں؟"
"اکثر_ لیکن کل جو میری بیٹی کھائے گی میں وہی کھاؤں گا۔"
"میں تو یہی کھاؤں گی۔"
"جھلی نہ ہووے تے_" دادی نے پیار سے کہا۔
پھر بابا اپنے مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر زمینوں پر چلے گئے۔
"دادی ماں! بابا کب واپس آئیں گے؟"
"ویسے تو عام طور پر مغرب سے پہلے لوٹتا ہے پھر جب آپ لوگ آئے ہوتے تو دوپہر کو لوٹ آتا ہے۔ آج بھی میرا خیال ہے کھانے تک آ جائے گا۔"
"بابا گاڑی پر کیوں نہیں جاتے۔"
"بس گھوڑے پر جانا پسند ہے۔ کہتا ہے ورزش بھی ہو جاتی ہے اور کھیتوں میں اندر تک جایا جا سکتا ہے۔"
مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو ہم بہن بھائیوں کو گھوڑے اور اونٹ کی سواری ضرور کراتے تھے۔ انھیں ایک اور بھی شوق تھا کہ ہم بہن بھائی سرائیکی ضرور سیکھیں۔ میں سرائیکی سمجھ تو لیتی تھی پر یونہی تھوڑی بہت آتی تھی۔
دوپہر کو کھانے کے وقت تک بابا لوٹ آئے تھے ہم تینوں نے کھانا کھایا دادی ماں نے بھنی ہوئی دیسی مرغی پکوائی ہوئی تھی۔ تنور کی روٹی اور لسی کے ساتھ بہت مزہ آیا۔
دادی نے اندر باہر سب ملازموں کو کھانا دیا۔ نوکرانیاں کچن سمیٹ کر تھوڑی دیر کے لیے چلی گئیں۔ تو بابا بستر کے بغیر (الاہنی) چارپائی پر سرہانے اپنا بازو رکھا اور کروٹ

کے بل لیٹ گئے۔
''بابا جان انھیں میں بستر بچھا دوں۔''
نہیں ایسے ہی ٹھیک ہے۔'' پھر وہ اپنے پسندیدہ شعر آہستہ آواز میں گنگنانے لگے۔
میں انھیں اپنے بچپن سے ہی سنتی آ رہی تھی۔ پھر مجھے سمجھ نہیں آتی تھی ایک آدھ بار میں نے پوچھا ''بابا اتنی اچھی آواز میں کیا گنگنا رہے ہیں۔'' تو ہنس کر ٹال دیا۔
پر اب مجھے پوری سمجھ آ رہی تھی۔
مولانا رومی کا مشہور شعر:
خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجامی آئید ایں آواز دوست

.....

دوسرا شعر وہ زیادہ گنگناتے تھے۔ اس کا شاعر مجھے معلوم نہیں۔
غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

.....

وہ اتنے جذب سے پڑھ رہے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ان کو بازو پر سر رکھ دیا۔ وہ پیار سے میرے سر کو تھپتھپاتے رہے۔
گزشتہ کل سے بابا جان پار گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ مزارعوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں اور دادی ماں رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چارپائیوں پر گھر کی روئی سے کھڈی پر بنوائے ہوئے چارخانے ڈیزائن کے سرخ اور کالی ڈبیوں والے یا پھر سفید لال کنارے والے کھیس یا دریاں بچھائی جاتی تھیں۔ سرہانے کڑھائی والے سفید جھک تکیے جن پر یا کوئی شعر لکھا ہوتا یا پھول پتیاں کڑھی ہوتیں یہ سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ بناوٹ سے پاک۔ سادگی اور محبت ایک دوسرے کی پاسداری۔ کتنی اچھی تھی ان لوگوں کی زندگی ایک شہر کی زندگی جو تکلفات اور دکھاوے سے بھری ہوئی ہے۔ ایک کھانے کو ہی لے لیں۔ شہر میں بلاوجہ میز کرسیوں پر چڑھ کر بیٹھو۔ سولہ برتن بھرو اور چھری کانٹوں سے کھانا کھاؤ۔ یہاں تو روٹی گندم کی تاڑ سے یا کھجور کے پتوں سے بنی چنگیز میں رکھ کر کھائی جاتی ہے۔ رنگ برنگی چنگیز دکھ کر ہی دل خوش ہو جاتا ہے۔
میں دادی ماں کے پاس بیٹھی اُن کے ساتھ پھلیاں بنوا رہی تھی۔ وہ مجھے بار بار منع کر رہی تھیں۔
''نہ میری سوہنی دھی۔ تیرے ہاتھ خراب ہو جان گے۔ یہ اتنی ساری کا میاں کس لیے ہیں۔؟''
''دادی ماں۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ آپ بھی تو بنا رہی ہیں۔''
''تیری ماں کو پتہ چل گیا تو ڈانٹ کھاؤ گی۔''
''اُن کو بتانے کون جائے گا۔؟ آپ یا بابا۔''
میں شرارت سے ہنسی تو ہنس پڑی۔
''میری دھی۔ سمجھدار ہو گئی ہے۔''
''دادی ماں۔ پردہ تو نہیں میں آ جاؤں۔
ایک مردانہ آواز آئی
''آ جاؤ۔ میرے بچے کوئی غیر نہیں تمھاری

بہن بیٹھی ہوئی ہے۔"
"السلام علیکم!" ایک اونچے لمبے چھ فٹے لڑکے نے دادی کے پاؤں چھو کر سلام کیا۔
"جیتے رہو۔ شالا جوانیاں مانو۔ کب آئے ہو لاہور سے۔؟
"کل ہی آیا تھا۔ چاچا سائیں تو پار گئے ہوئے ہیں۔"
"میں آپ کو ملنے چلا آیا۔"
"جم جم آؤ پتر۔"
"سکھاں مجھے روک رہی تھی۔ کہہ ہی تھی دادی کے پاس مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔"
"یہ تمھارے چاچے کی بیٹی ردا ہے۔ یہ بھی دو چار روز پہلے لاہور سے ہی آئی ہے۔ تم نے پہچانا نہیں۔"
"نہیں دادی ماں۔ بہت سال بیت گئے انھیں دیکھے ہوئے۔ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔"
"اب آپ نے مجھے یاد دلایا تو مجھے یاد آ گیا۔ ویسے میں ان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ میرے بازو پر ابھی تک ان کے دانت کاٹنے کے نشان ہیں۔"
میں شرمندہ سی ہو گئی۔ "آپ نے ابھی تک معاف نہیں کیا۔"
"نشان مٹ گیا تو معاف کر دوں گا۔" پھر ہنس پڑا۔
"میں مذاق کر رہا تھا۔ بچپن کی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔"
سعدی کچھ دیر بیٹھا رہا میرے بہن بھائیوں اور ماما کے بارے میں پوچھا۔ میری پڑھائی کا پوچھا۔ اپنا بتایا میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دادی ماں سے پوچھا۔
"دادی ماں۔ تایا لوگوں سے ملنا جلنا کیوں نہیں ہے۔؟"
"بس جانے دو بچی۔ گڑے مردے کیا اُکھاڑنے ہیں۔"
"پھر بھی میں جاننا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ان میں اور ہم لوگوں میں مالی لحاظ سے بھی بہت فرق ہے۔"
"میری دھی۔ کیا بتاؤں؟ تیرے تایا نے تھیٹر میں ناچنے والی سے شادی کر لی تھی۔ یہ بھی لاہور میں ہی پڑھ رہا تھا کہ وہاں میلہ چراغاں پر تھیٹر میں اس کلموہی کو دیکھا اور جی جان سے فدا ہو گیا۔
تمھارے دادا کو اس روز پتہ چلا۔ جب یہ اسے لے کر فرار ہو گیا۔ کیونکہ اس کے والی وارث بھی اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے وہ تیرے تایا اور اس کم ذات کو تلاش کرتے یہاں پہنچ گئے۔ کئی سال اس کو کوئی خبر نہ ملی۔ تمھارے دادا اللہ بخشے کو اتنا دکھ اور صدمہ پہنچا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ اپنی وفات سے پہلے ساری زمین جائیداد تمھارے بابا کے نام گفٹ کر دی۔ ہم سب کو تاکید کی کہ اگر وہ کبھی ادھر آ نکلے تو اس ننگ خاندان کو میں عاق کر چکا ہوں۔ ہمارے لیے وہ مر چکا ہے۔ اس کی وجہ سے سارے زمانے میں میری جو ذلت ہوئی وہ میں بھولا نہیں۔ اس نے شریکوں کے

سامنے میری پگ مٹی میں رول دی۔ مجھے سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں جو لوگوں کے فیصلے کرتا تھا میرے بیٹے نے مجھے کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔

''تمھارے دادا کے فوت ہونے کے بعد بیوی کو لے کر ماں مارا نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ مندے حال۔ شکلوں بے شکل۔ میں ماں تھی مینڈھی دھی۔ میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''تمھارے بابا نے حویلی بھی بنا کر دے دی کچھ زمین بھی دے دی۔ ہمیشہ سے ہی اس کی عادات نہ جانے کس پر تھیں۔ جھگڑالو بدزبان اور کردار کا بھی اچھا نہیں تھا۔ تمھارے بابا اتنے ہی فرماں بردار دھیمے مزاج۔ نیک اور محبت کرنے والے ہیں۔

''یہ کرماں مارا لڑکپن سے ہی تمھارے بابا سے حسد کرتا تھا۔ اب بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی مزاعوں کو بڑھکاتا ہے کبھی پانی کاٹ لیتا ہے۔ بس کوئی نہ کوئی ذلیل حرکت کرتا رہتا ہے۔ تمھارے بابا خاموش رہتے ہیں۔ میں نے اس کی حویلی جا کر ہزار بار اس کو سمجھایا ہے لیکن اس کی مت تو اس کی بیوی نے مار چھوڑی ہے۔ یہ بھی شکر ہے بیٹی کوئی نہیں دو بیٹے ہی ہیں دونوں اچھے لائق ہیں اور سبھاؤ کے بھی اچھے ہیں۔'' جب تمھارے بابا نہیں ہوتے تو ملنے چلے آتے ہیں۔ کیا کروں۔'' بیٹی اپنا خون ہے۔ اس کی بیوی کم بخت کو تو میں نے کبھی ادھر گھسنے نہیں دیا۔ وہ بدنصیب بھی نہیں آتا۔'' دادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے انھیں گلے سے لگا کر پیار کیا۔ ''اگر سعدی اور اس کا بھائی بابا کے سامنے آئیں گے تو وہ خفا ہوں گے۔''

''نہیں میرا خیال ہے خفا نہیں ہوگا۔ وہ خود ہی ڈرتے ہیں۔''

ہمارا راجن پور جانا کافی کم ہو گیا تھا۔ میں اور بہن دونوں پڑھائیوں میں مصروف تھے۔ اور بھائی دونوں ابھی باہر تھے۔ بابا دو تین مہینوں کے بعد آتے تھے اور مہینہ بھر رہ کر چلے جاتے تھے۔ بابا ہمارے پاس آئے ہوئے کہ گاؤں سے پھوپھو رقیہ کے فوت ہونے کی اطلاع آئی۔ ماما کا پتے کا آپریشن ہوا تھا۔ اس لیے میں بابا کے ساتھ چلی گئی۔ کیونکہ مجھے دادی ماں اور برگد دونوں یاد آ رہے تھے۔

دادی ماں کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ چہرے پر جھریوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ پھوپھو کی موت نے انھیں بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا۔

برگد اسی طرح قائم دائم تھا۔ اس کا تنا مزید موٹا ہو گیا تھا۔ اور شاخیں بھی مزید پھیل گئی تھیں۔

میں اکثر سوچتی کتنے راز اس کے سینے میں دفن ہوں گے۔ اگر یہ بول سکتا تو کیسے کیسے راز اگلتا۔ میرا راز بھی تو ہوگا۔ سعدی جانے مجھے کیوں اچھا لگنے لگا تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی اسے دیکھ کر میرا دل دھڑک اُٹھتا۔

ایک چاندنی رات میں صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اچانک برگد کے پاس ایک سایہ نظر آیا۔

خوف کے مارے خون میری رگوں میں جم سا گیا۔ اندھیرے میں سے سایہ نکلا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پیشتر اس کے میں چیختی اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

سرگوشی میں بولا۔ ’’سعدی ہوں۔‘‘

’’توبہ! تم نے تو میری جان نکال دی۔ تم کیا کر رہے ہو اس وقت۔‘‘

’’اور تم کیا کر رہی ہو۔؟ میرا انتظار۔؟‘‘

’’میں تو ایسے ہی واک کے لیے نکلی تھی؟‘‘

’’دادی سے مل کر تمھیں ملنے چلا آیا۔ صبح واپس جا رہا ہوں۔ پھوپھی کی فوتیدگی کا سن کر آیا تھا۔‘‘

’سنا ہے۔ لوگ ڈاکٹر بن گئے ہیں۔‘‘

’’جی جناب ہاؤس جاب ختم کر کے اب سپلائزیشن چل رہی ہے۔‘‘

اس نے جیب سے ایک گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھ دی۔

’’یہ کیا کر رہے ہو۔‘‘

’’کچھ نہیں۔ اس کی ٹک ٹک تمھیں میری یاد دلاتی رہے گی۔‘‘

’’یاد کرو گی نہ مجھے۔‘‘

میں خاموش رہی۔

’’چلو مت بتاؤ۔ میں جانتا ہوں تم مجھے یاد کرو گی۔‘‘

پھر پتہ چلا کہ تایا نے سعدی کے لیے میرا رشتہ مانگا تھا۔ پر بابا نے انکار کر دیا۔

اس رات میں اپنے کمرے میں دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ نہ جانے کیوں؟‘‘

کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ سعدی امریکہ چلا گیا ہے۔ میں روئی تو نہیں۔ پر دل جیسے اندر سے خالی ہو گیا ہو۔

کچھ مہینوں کے بعد میرا ماسٹر کا رزلٹ آیا، تو گھر میں میری شادی کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ میں خاموش تماشائی تھی۔

ایک روز بابا بڑے اہتمام سے میرے کمرے میں آئے اور میرے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ذرا رک کر بولے

’’تمھاری بہن کے دیور کا رشتہ آیا ہے۔ گل زیب تمھارا دیکھا بھالا ہے۔ کافی گڈ لوکنگ اور اچھے سبھاؤ کا شریف لڑکا ہے۔ اور سول سروس میں ہے۔ آگے بہت ترقی کرے گا۔ تمھاری بہن اور بہنوئی بھی اس رشتے پر بہت خوش ہیں۔‘‘

میرے آنسو ٹپ ٹپ میرے ہاتھوں پہ گر رہے تھے۔

بابا نے میرا بازو پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ ’’تمھیں کوئی اور پسند ہے۔‘‘

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’مجھے تو تم نے ڈرا ہی دیا تھا۔‘‘ بابا نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔

’’میں جانتا تھا میری بیٹی کو ہماری پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔‘‘

پھر میری شادی ہو گئی۔ ایک ان کہی ادھوری کہانی کا اختتام ہو گیا۔ میری شادی پر سب بے انتہا خوش تھے۔ دونوں بھائی بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آ گئے تھے۔ میری بہن کو اللہ تعالیٰ نے بیٹے سے نوازا تھا۔

بابا خاص طور پر بے انتہا خوش تھے۔ میں نے اپنی ساری زندگی انھیں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ کسی کو میرے دل کے گھاؤ کی خبر نہیں تھی۔ اس لیے میں بھی خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ویسے بھی اب دکھی ہونے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ پر یہ جو دل ہے یہ بڑا پاگل اور مورکھ ہے۔

میری شادی کو تین ماہ بیت چکے تھے۔ زندگی ایک دھارے پر چل نکلی تھی۔

بابا آئے ہوئے تھے۔ اس لیے میں چند روز کے لیے ماما کی طرف آ گئی تھی۔

ماما اور بھائی بابا کے ساتھ گاؤں جا رہے تھے۔ میرا دل تڑپ رہا تھا۔ دادی ماں اور برگد سے ملنے کو۔

میں نے دبے لفظوں میں ماما بابا سے کہا۔

''نہیں! بیٹا ابھی وقت ہی کتنا بیتا ہے تمھیں سسرال میں۔ ان شاء اللہ پھر کبھی ضرور جانا۔''

''بابا جان۔ میں دادی ماں کے لیے بے حد اداس ہوں۔''

''بیٹا_ تمھاری ماں درست کہہ رہی ہے۔''

''بابا جان_ بھائی بھی تو جا رہے ہیں۔''

بابا ہنس پڑے۔ پگلی۔ بیٹی۔ اُن کا جانا ضروری ہے۔ میں انھیں زمینوں اور لوگوں سے روشناس کروانا چاہتا ہوں۔ کل کو انھیں ہی سب کچھ سنبھالنا ہے۔''

''خدا کے لیے بابا جان۔ مجھے نہیں لے جانا چاہے تو نہ لے جائیں۔ پھر ایسی خوفناک باتیں نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا کرے۔'' میں اُن سے لپٹ گئی۔

سب نے میری بات کی تائید کی۔

جب میں گاؤں پہنچی تو بابا جان کا جنازہ برگد کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ رشتے داروں اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ (اب کسی کو پردے کی پرواہ نہیں تھی) ماما اور بہن بھائی رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔ رشتے دار عورتیں، مزارعوں کی بیویاں اور کامیاں اونچے اونچے بین ڈال رہی تھی۔ ایک بین اٹھاتی تو دوسری اس کے ساتھ شامل ہو کر اگلی بات جوڑتی۔

''ہائے۔ سائیں اتنے نیک تھے۔ کبھی کسی کو میلی آنکھ سے نہ دیکھا۔ سب کو اپنی بہن، بیٹی سمجھتے تھے۔ ہائے اتنے سخی تھے۔ سال بھر کا اناج ہمیں دیتے۔ ہمیں گھر بنا کر دیئے ہوئے تھے۔ دکھ سکھ میں کام آتے۔ ہائے ہم یتیم ہو گئے۔''

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔ 'میرے بابا کو تو سب چاہتے تھے۔ میرا دل جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ مجھے دادی ماں کے لیے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اتنی کمزور اور ضعیف تھیں کہ شاید ان کے اندر رونے کی بھی سکت نہیں تھی۔ ان کے غم کے سامنے مجھے اپنا غم ہیچ لگ رہا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے رونا نہیں آ رہا تھا میں بس بابا کے سرہانے بیٹھی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور انھیں بے آواز پکار رہی تھی۔

''مجھے اب آواز دوست کہاں سے آئے گی۔؟''

میرے واحد دوست تو آپ ہی تھے۔

منشی چاچا روتے ہوئے ہر ایک کو بتا رہے تھے۔
''سویرے مجھے سائیں کا فون آیا تھا۔ ''ہم زمینوں پر آ رہے ہیں۔''
میں نے پوچھا۔ کون کون ساتھ ہو گا سائیں۔''
کہنے لگے۔ ''شاہ میر خان اور امیر زادہ خان۔ دونوں ساتھ ہوں گے۔'' ان کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔
تمباکو کے کھیتوں سے ہوتے ہوئے آموں کے باغ کے اندر آ گئے۔ اور ساتھ ساتھ بچوں کو بتا رہے تھے۔
''ہم تمباکو کی کھڑی فصل کا سودا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ پشاور سے آتے ہیں۔ فصل کو وہی لوگ سنبھالتے ہیں۔''
''بابا جان گندم کی کھڑی فصل کا سودا نہیں ہوتا۔''
سائیں ہنسے۔ میں بھی ہنس پڑا۔
''نہیں بیٹا۔ گندم کی فصل کٹتی ہے۔ پر بھوسہ اور دانے الگ کیے جاتے ہیں پھر گندم بوریوں میں بھر کر منڈی میں جاتی ہے۔''
''یہ آم کے باغ کو دیکھو۔ یہ انور رٹول ہے۔ یہ بہت میٹھا اور خوشبودار ہوتا ہے۔ اس کی بھی ہم کھڑی فصل ہی بیچ دیتے ہیں۔ وہ لوگ خود ہی اتارتے ہیں اور پیک کر کے باہر بھیجتے ہیں۔ اچانک سائیں نے شاہ میر سائیں کو دھکا دیا اور خود ان کے آگے آ گئے۔ دونوں گولیاں سینے میں لگیں۔ ایک تو دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ سائیں وہیں گر پڑے۔ شاہ میر خان نے جلدی سے ان کو سیدھا کیا۔ پر وہ اسی وقت دم توڑ چکے تھے۔
کسی نے پوچھا۔ ''تم میں سے کسی نے قاتل کو نہیں دیکھا۔''
''جدھر سے گولیاں آئیں ہم تینوں کی پشت تھی۔ سائیں کا منہ اس طرف تھا۔''
لوگ وہاں عجیب عجیب باتیں کر رہے تھے۔
کسی طرف سے میرے کان میں سرگوشی آئی۔ ''یہ بڑے بھائی کا کام ہے۔ وہ بڑا ظالم ہے۔ سائیں نے بیٹی کا رشتہ نہیں دیا۔ اسی وقت سے غصے کی آگ میں جل رہا تھا بیٹے کے لیے رشتہ لے کر اس حویلی میں گھسنا چاہتا تھا اس کا نشانہ شاہ میر خان تھا۔ وہ سائیں کو تڑپانا چاہتا تھا۔''
''ہائے سانپوں کو دودھ پلاتا رہا میرا ویر۔''
یہ چھوٹی پھوپھی کی آواز تھی جو دادی ماں کے پاس رہتی تھی۔
اگلے دن میں نے عجب منظر دیکھا۔ ڈھیر سارے مزدور کلہاڑیاں، آریاں اور لکڑی کاٹنے والی مشینوں سے برگد کو کاٹ رہے تھے۔
دادی روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔
''اس کو کاٹو۔ اس نے میرے گھر کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ میرا شہزادہ چلا گیا۔ اس منحوس کو جڑ سے کاٹ دو۔''
جب برگد کٹا تو میں دادی سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رو پڑی۔
پھر میں کبھی راجن پور گاؤں نہیں گئی۔ حتیٰ کہ دادی اماں کی فوتیدگی پر بھی نہیں گئی۔

☆☆☆☆☆

سدا نہ ماپے حسن جوانی

رانی بہت حسین تھی--- سرخ و سنہری لمبے بال، شربتی آنکھیں، چمپئی رنگت ---اور چہرے پر پھیلی دلکش مسکراہٹ---

بچپن سے ہی جو اسے دیکھتا اس کا گرویدہ ہو جاتا--

اسے بہت محبتیں حاصل تھیں---ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی - -اپنے استادوں کی پسندیدہ شاگرد-- دوستوں کی محفل میں سب سے نمایاں دکھنے والی- - -اس کی محبوبانہ ادائیں، دلکش لب ولہجہ اور ہمدردانہ رویہ--- اجنبی بھی ملتے تو دوست بن جاتے--

ساری زندگی آرام و آسائش اور محبتیں سمیٹتے گزری---

ہر تہوار ہر میلہ اس نے جی بھر کے منایا--- رانی زندگی سے بھرپور ایک ایسی ہستی تھی--- جو غم زدوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دیتی - - -اس کی شخصیت میں ایک جادو تھا---ایک سحر تھا---

عید آتی تو سہیلیوں کے جھرمٹ میں-- مہندی لگوانے جاتی-

چاند رات میں چوڑیاں پہنتی---اس کی کھلکھلاتی ہنسی سن کر گویا چاند زمین پر اتر آتا---

جو سہیلیاں کمزور ہوتیں--اس نے کبھی ان کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا تھا- سب کے لیے عید کے تحائف خریدتی--اور چپ چاپ ان کے گھر چھوڑ آتی---انھیں یہ خوشی دے کر اس کے چہرے کی رنگت اور سرخ ہو جاتی--اور کشمیری سیبوں جیسی-- رانی کا دل خوشی سے جھوم جاتا-

ہندو سہیلیوں کے ساتھ دیوالی، دسہرا، شیو راتری-- بھی اسی طرح مناتی-- جیسے شب برأت کا تہوار منایا جاتا-

اپنی کرسچن سہیلیوں کے ساتھ کرسمس منانا اور ہیلووین منانا بھی اس کا مشغلہ تھا-

وہ انسانیت کی پرچارک تھی---انسان کو رنگ نسل زبان قومیت اور مذہب میں بانٹنے والوں کے خلاف تھی--

انسان کی شخصی آزادی کو ہی اس دنیا کی خوبصورتی سمجھتی تھی---اس کا کہنا تھا---یہ

نیلما ناہید درانی

دنیا اس دن بدصورت ہوئی تھی -- جب انسان نے ایک دوسرے کے لیے ہتھیار اٹھایا تھا--

انسانیت پر اس نے ظلم کیا-- جس نے پہلا ہتھیار بنایا-- زمین پر پہلی لکیر کھینچی-- اور کہا یہ میری ملکیت ہے--

یہ زمین تو سب کی ہے کیونکہ سب نے آخر کار اس میں سمانا ہے-- پھر یہ تقسیم کیسی-- انسان کو بھی پرندوں کی طرح آزاد ہونا چاہئے--

وہ جب چاہیں جہاں چاہیں جا سکیں-

سائبیریا کے پرندے موسم بدلنے کے ساتھ جیسے ہجرت کرتے ہیں اسی طرح انسان کو بھی حق حاصل ہو وہ جب چاہیں ہجرت کریں اور جب چاہیں اپنے گھروں کو لوٹ آئیں-- کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر--

مگر افسوس انسان آزاد نہیں ہے-- اس نے خود کو خود ہی محکوم کر لیا ہے-- اپنے گرد خود ہی لکیریں کھینچ لی ہیں-- اپنی سرحدیں خود ہی بنا لی ہیں اور قیدی بن کر رہ گیا ہے -- محبت کرنے کے بجائے نفرت کرنے کے ہزاروں بہانے تراش لیے ہیں-

کچھ سرحدیں دکھائی دیتی ہیں مگر کچھ سرحدیں پوشیدہ ہیں لوگوں کے دلوں میں-- وہ ہی نفرت اگلتی ہیں-- جو نفرت آنکھوں اور پھر زبانوں سے بہہ نکلتی ہے--

زبانوں سے پھیلائی نفرت---- تلوار اور ہتھیار سے پھیلائی نفرت سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے-- کیونکہ انسان ازل سے کانوں کا کچا ہے-- وہ ہر اس بات کا یقین کر لیتا ہے جو الفاظ کے ذریعے اس کے کانوں میں انڈیلی جاتی ہے-- اس لیے ہوشیار تو میں-- ہتھیار اٹھا کر جنگ لڑنے کے بجائے-- میڈیا وار کا سہارا لیتی ہیں-- جو اس زمانے کا سب سے موثر ہتھیار ہے-

ہیلووین-- رانی کا سب سے پسندیدہ تہوار تھا-- وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اکتوبر کی سرد راتوں میں- مختلف بلاؤں کے حلیے بنا کر ٹوکری ہاتھ میں لیے- ہمسایوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجاتی-- ہمسایے اس حملے کے لیے پہلے سے ہی تیار ہوتے-- وہ ان کی ٹوکریوں میں -- چاکلیٹ اور مٹھائیاں ڈال دیتے-- یوں یہ بلائیں خوشی خوشی واپس آ جاتیں-

ہیلووین ایک خوبصورت تہوار ہے جو مغربی ممالک میں ہر سال 31 اکتوبر کو منایا جاتا ہے--

اس کی تیاری کے لیے-- تمام دکانوں پر مختلف بلاؤں کے لباس، میک اپ کا سامان- ہتھیار اور بڑے چھوٹے ہر سائز کے نارنجی رنگ کے حلوہ کدو-- آ جاتے ہیں-

لوگ یہ چیزیں اپنے گھروں کے باہر بھی سجاتے ہیں-

رانی -- کو چڑیل بننا بہت اچھا لگتا تھا-- اس کے لیے اسے اپنے چہرے پر بہت سی کالک

لگانی پڑتی-- پھر بھی اس کی سنہری رنگت کہیں کہیں سے جھانکتی رہتی-- کالا لمبا چولہ-- ہونٹوں پر لال سرخی سر پر سنگھ لگا کر وہ ہاتھ میں ٹوکری پکڑے ہیلووین منانے جاتی--

اسی طرح کئی برس گزر گئے-- اسے ہر سال ہیلووین کا انتظار رہتا-- جیسے عید کی چاند رات کو مہندی لگوانے اور چوڑیاں پہننے کا-

رانی کی شادی ہوئی تو اس کے بچے یہ سب تہوار منانے لگے— وہ اپنے بچوں کے ساتھ جاتی انھیں وہ سب چیزیں خرید کر دیتی اور خوش ہوتی—

وقت تیزی سے گزر گیا-- بچوں کی شادیاں ہو گئیں --- تو ان کے بچے --- رانی کی نواسیاں، پوتیاں، نواسے اور پوتے --- یہ سب تہوار منانے لگے—

رانی میں اب وہ طاقت اور ہمت نہیں رہی تھی— کہ وہ پیدل چل کر ان کے ہمراہ جاتی-- مگر پھر بھی اسے بہروپ بھرے بچے -- گھروں کی گھنٹیاں بجاتے اور چاکلیٹ لے کر خوش ہوتے-- دیکھنا بہت پسند تھا—

وہ ہیلووین کی رات اپنے بیٹے سے کہتی--- مجھے بھی ساتھ لے چلو— میں نے بھی یہ سب دیکھنا ہے--

اس کا دل ابھی بھی بچہ ہی تھا--

اس برس ہیلووین آئی تو وہ اپنے بیٹے، پوتے پوتیوں کے ہمراہ-- شہر کے مختلف محلوں میں گئی— چمگادڑوں سے سجے گھر-- پلاسٹک کی کھوپڑیاں-- ڈھانچے ---وہ گاڑی میں بیٹھی دیکھ رہی تھی— اس کا بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ مختلف گھروں کی گھنٹیاں بجا رہا تھا-- وہ خوشی اور حیرت سے یہ سب دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی---

اسی دوران -- بچوں کی ایک ٹولی -- اس کی کار کے پاس سے گزری -- جنھوں نے مختلف بلاؤں کے روپ بھرے ہوئے تھے-- کالے ربن پہنے ایک بچی نے اس کی طرف دیکھا-- تو اپنی ماں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا—

ماما-- دیکھو اس گاڑی میں چڑیل ہے-

رانی نے اس روز چڑیل کا حلیہ نہیں بنایا تھا-- مگر اس بچی کا اشارہ اسی کی طرف تھا--

رانی نے کار کے سائڈ میرر میں خود کو دیکھا—

شیشے میں سفید بالوں، ڈھلکی جلد اور ویران آنکھوں والی بڑھیا کا چہرہ تھا— جو واقعی چڑیل لگ رہی تھی--

اس کا رنگ روپ حسن جوانی وقت کے دھارے میں کہیں کھو چکا تھا—

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے-- اور میاں محمد بخش کا شعر یاد آ گیا:

سدا نا ماپے حسن جوانی سدا نا صحبت یاراں
سدا نا باغی بلبل بولے سدا نا باغ بہاراں

☆☆☆☆☆

پیدائش کا گمشدہ باب

کون ہے جو تیری آنکھ میں میرے لیے ہمدردی کی نمی اور تیرے دل میں میرے لیے ترس پیدا نہیں ہونے دیتا، کون ہے جو آسمانوں میں موجود مہربان روحوں کو میری طرف راغب ہونے سے روکتا ہے، کون ہے جو زمین پر میرے راستوں کو طویل اور دشوار گزار کیے جا رہا ہے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ شہر کی غریب اور خوبصورت کنواریاں اور حسین مگر ٹھکرائی ہوئی ہوائیں کیوں مجھے حقارت اور تمسخر سے دیکھ کر میری محبت بھری مردانگی کو دھتکارنے پہ آمادہ رہتی ہیں؟ کون ہے جو میری تاریک اور اندیشوں بھری راتوں کو خوفناک بنانے میں خوشی اور تسکین حاصل کرتا ہے، کس کو مجھ سے جنم جنم کا بیر ہے کہ جو مجھ سے ملنے جلنے والوں کو بدظن اور بدگمان کیے جا رہا ہے؟ کون ہے جو میرے رزق کو گھٹانے اور میری غربت اور بھوک کو بڑھانے میں بے قابو اور قادر ہوئے جاتا ہے، میری زندگی کو تکلیف دہ، بے وقعت اور پستیوں میں دھکیل کر کون میری موت کو آسان اور میری آخری خواہش بنانے پر تلا ہوا ہے، کون ہے، کون ہے؟؟؟

اپنے سانسوں کو قابو کرتے ہوئے اس کا جسم لرزنے لگا، اشتعال اور مایوسی کی وجہ سے اس کے حلق میں خشک کانٹے سے اترنے لگے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اس کی کلہاڑی کا ٹھنڈا اور سخت لوہا چبھنے لگا تھا اس نے بہت سالوں سے لکڑیاں کاٹنا چھوڑ دیں تھیں۔ اب وہ کلہاڑی کا لمبا اور مضبوط دستہ زمین پر ٹکائے، لاٹھی بنائے پھرتا تھا۔ دیوتا کے مجسمے کے سامنے کھڑا ہو کر آج اس نے احتجاج کرنے کا ارادہ بنا رکھا تھا۔ پہلے وہ عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہی مجسمے کے پیروں میں سر رکھ کے رحمتوں اور برکتوں کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ جھکنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی گزشتہ دعاؤں کی تکفیر کرنے پہ تل گیا تھا۔ وہ خاموش ہو چکا تھا لیکن اس کا بدن لرز رہا تھا اور عبادت گاہ کی سرخ اینٹوں والے فرش پہ اس کی کلہاڑی کا دستہ ٹک ٹک گونجنے لگا تھا اس نے اپنے لرزتے جسم اور جذبات کو قابو کرنے کی

کلیم خارجی

کوشش میں مجسمے کو گھورنا شروع کر دیا۔
اُسے یوں لگا جیسے مجسمہ بھی اُسے گھورنے لگا ہے۔ ایک تسکین اور توانائی کی لہر اس کے بدن میں دوڑنے لگی۔ اس نے کلہاڑی کا پھل دوسرے ہاتھ میں پکڑ اپنی آنکھیں مجسمے کی آنکھوں میں گاڑھ دیں اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ساری رات مجسمے کو گھورتا رہے گا۔ اور آئندہ بھی سجدوں کی بجائے منتوں اور دُعاؤں کے بجائے احتجاج اور سخت کلامی کا رویہ اپنائے رکھے گا۔
پچھلے کئی برسوں سے اس نے عبادت گاہ کے خادم اور پہرے دار کو خوشامد اور رشوت کے ذریعے اس بات پر پہ آمادہ کرلیا تھا۔ کہ وہ اُسکے لیے رات کے آخری پہر عبادت گاہ کا دروازہ کھول دیا کرے گا۔ تاکہ وہ ساری رات یکسوئی اور خلوص نیت سے پوجا کرتا رہے گا۔ اور صبح کے آخری ستارے کی روشنی میں واپس چلا جایا کرے گا۔ پہرے دار کو یہ سودا بہت پسند آیا تھا۔ وہ اُسے عبادت گاہ میں داخل کر کے سکون کے ساتھ گھر چلے جاتا۔ اور سردی کی طویل رات میں وہ اپنی جوان بیوی کے پہلو میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی ڈھونڈنے میں مگن رہتا۔
مجسمے کے سامنے کھڑے کھڑے اُسے یوں لگا جیسے سنگ مرمر کے نازک اور ملائم ہاتھوں میں حرکت ہونے لگی ہے اپنی احتجاج بھری گفتگو کا اثر سمجھ کر وہ ایک بار پھر زخمی اور ہارے ہوئے سپاہی کی طرح للکارتے ہوئے بولا، کون ہے جو شہر کے ہر آدمی کو میرے ناک میں گھسنے کی طاقت دیئے جا رہا ہے جسکی وجہ میرے سینے پہ بوجھ بڑھ جاتا ہے اور میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ کون ہے وہ دم لینے کے لیے رُکا۔ اور اسکی آنکھیں مجسمے کی ناک پہ جم گئیں۔ مجسمے کے نتھنے دیکھ کر اسکی سانس رکنے لگی۔ یکا یک اس نے کلہاڑی اپنے سر سے اونچی اُچھال کر اس کا دستہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بہت بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اس نے کلہاڑی کے پھل کا ایک نوکیلا حصے سے مجسمے کے بند نتھنے کھولنے شروع کیے۔ اپنے ہاتھوں کی طاقت اور مجسمے کی نازکی سے بے خبری کے باعث اس کی کلہاڑی کی رگڑ سے مجسمے کی ناک چیخ کر زمین پہ گرتے ہی بکھر گئی۔ اُس کے جسم میں پھر سے کپکپی شروع ہوگئی۔ اپنے چہرے پہ تپش محسوس کرتے ہوئے وہ مجسمے کو تسلی دیتے ہوئے بولا، میں صندل کی لکڑی سے تمہاری بہت خوبصورت اور مضبوط شبیہ تراشیوں گا میں ساری عمر لکڑیاں کاٹتا رہا۔ اگر میں کلہاڑی سے تمہاری شبیہ بناتا تو شاید تم مجھے برکتیں دیتے رہتے بغیر ناک کے مجسمے کو دیکھتے رہنے سے اس کے اندر حوصلہ پیدا ہوگیا۔ اس نے کلہاڑی اپنے بائیں ہاتھ میں تھام کر دائیں ہاتھ کو مجسمے کے چہرے پہ پھیرتے ہوئے اپنے بدلے ہوئے لہجے میں کہا، آخر میرے آس پاس سچے، ذہین اور محبت کو سمجھنے والے لوگ اب تک کیوں پیدا نہیں ہو پائے، اتنی بھیڑ میں میری ذات اکیلی، غیر محفوظ اور اجنبی کیوں ہے؟ بے اختیار وہ مجسمے کی پشت کی جانب کھڑا ہوگیا۔ پھر اسکی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنستے ہنستے اُس نے دستہ ہاتھ میں پکڑ کر اپنی طرف سے پھر کوئی اختراع پیدا کرنے کی

کوشش کی۔ اور یکدم سے اس کے سامنے ایک شگاف کھل گیا۔ اس کے پیروں میں چمکتے ہوئے ہیروں اور سونے کی موتیوں کا ڈھیر بننے لگا۔ اس نے نیچے جھک کر مٹھی بھری تو اس کی سانس بحال ہوئی اور وہ ہلکا پھلکا سا ہو کر گہرے سانس لینے لگا اُسے یوں لگا جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیارے سے زمین پہ اترا ہے۔ اُسے اپنی کلہاڑی کی طاقت کا احساس ہونے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے بہت دور کی چیزوں تک اپنی کلہاڑی کا پھل استعمال کر سکتا ہے۔ مستی میں آ کر اُس نے مٹھی میں بھرے ہوئے سونے کے موتی اور ہیرے ہوا میں اچھال دیئے۔ اس نے مجسمے کی پشت پر دو تین وار کیے مجسمے کے ٹکڑے اور ہیرے اور سونے کے موتی عبادت گاہ کے فرش پر پھیل گئے۔ ابھی اس کے جانے اور پہرے دار کے آنے میں بہت وقت تھا۔ وہ کلہاڑی کا پھل کاندھے پہ ٹکائے بیٹھ گیا۔ اور پہرے دار کا انتظار کرنے لگا۔ پہرہ دار بہت دیر کے بعد عبادت گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اسکی جواں بیوی بھی تھی۔ جسکا سفید اور بھرا ہوا جسم عبادت گاہ میں مجسمے کی کمی کو پورا کرنے لگا تھا۔ پہرے دار نے فرش پر مجسمے کے ٹکڑے موتی اور ہیرے بکھرے ہوئے دیکھے تو وہ وحشت زدہ ہو کر سسک سسک کر اچھلنے لگا۔ اس کی بیوی نے اُسے دبوچ کر اُسے سنبھالا تو وہ اذیت برداشت کرتے ہوئے چیخا، اسے زمین پر سب سے زیادہ کمینے اور ظالم آدمی۔ تم ہم پر قیامت ڈھانے کے ذمہ دار بنے ہو۔ تمہاری وجہ سے زمین پر عذاب اُترے گا۔ تم نے میری عبادت کی نیت بھی پامال کر دی۔ میں نے اور میری بیوی نے اس مجسمے کے گرد عریاں ہو کر طواف کرتا تھا کہ ہم زندگی کی تمام مسرتوں کے ساتھ جی سکیں۔ تم نے ہمیں نحوست کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ پہرے دار تڑپتے ہوئے پیٹتے ہوئے بیوی کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر پڑا دیوانوں کی طرح چیختے ہوئے اس نے زمین پر بکھیرے ہوئے موتی اور ہیرے نگلنا شروع کر دیئے۔ اور پھر اچانک تڑپ تڑپ کر وہ سرد ہو گیا۔ عبادت گاہ میں یکدم خاموشی سے سکون پیدا ہوا تو پہرے دار کی بیوی اسکے بے جان جسم کو چھوڑ کر اپنے سامنے کھڑے ہوئے مضبوط اور چوڑے سینے والے آدمی سے یوں بولی جیسے وہ ابھی ابھی قید خانے کے دروازے سے باہر نکلی ہو، کیا تم میری بات سن کر سمجھ سکتے ہو؟ ہاں کیوں نہیں۔ وہ اعتماد اور اپنائیت سے بولا، آج میرے کانوں کے پردے کھلے ہیں۔ اور میری آنکھوں نے پہلی مرتبہ دیکھنا شروع کیا ہے، میرے اندر سے آج بدروحیں نکل کر بھاگ گئیں ہیں۔

ہاں شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آتے ہوئے دلیری سے بولی، میں مجسمے کے خوف اور اس کے تقدس میں خریدی ہوئی۔ اور عجیب طرح سے بکی ہوئی عورت ہوں۔ میں نے کبھی عبادت گاہ نہیں دیکھی تھی۔ دن کی روشنی میں اندھیرے میں رہنا میرے لیے ضروری تھا۔ میں نے کبھی اپنا چہرہ اور اپنا جسم غور سے نہیں دیکھا تھا۔ پہرے دار نے مجھے بڑے

عجیب طریقے سے خرید رکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنے سے زیادہ مجھے اپنے سے زیادہ خوبصورت، طاقتور یا دولتمند آدمی سے ملنے نہیں دیا تھا۔ ایک عمر تک وہ مجھے بانجھ رکھے ہوئے تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود بھی بانجھ ہو کر رہ گیا۔ میں گرمیوں کے موسم میں ندیوں میں نہانے کے خواب دیکھتی رہی۔ اور سخت سردیوں میں گرم ریت پہ لیٹنے کی حسرتوں میں مبتلا رہی ہوں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے شفقت اور گرمجوشی سے بولا، اب تم آزاد ہو۔ اور اس سے پہلے کہ یہاں کوئی نیا مجسمہ نصب ہو جائے کہیں نکل بھاگو۔ آج کل جاڑے کا موسم ہے۔ میری چادر اوڑھ لو۔ اور صحرا کی ریت پہ لیٹنے کی خواہش میں بھاگ جاؤ۔ اس نے اپنی جسم سے لپٹی ہوئی چادر اُتار کر اس کے بدن پہ ڈال دی۔ تو وہ ممنون ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ مجسمے توڑنے کے جرم میں تم کو زندہ جلا دیا جائے۔ میں تمہیں لے کر بھاگ جاؤں گی۔

آج تو جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنائیت سے بولا، میں حیران ہو کہ میری محنت اور مشقت کی کمائی کس طرح اس مجسمے میں اُترتی رہی ہے۔ اس مجسمے کی پوجا سے میں ساری عمر گناہ اور سزا کے خوف میں اس طرح جکڑے رہا کہ سیدھا چلتے چلتے میری ریڑھ کی ہڈی گردن سے پشت تک لوہے کی ٹھنڈی سلاخ کی طرح سخت ہو چکی ہے۔

اس مجسمے کے دوسرے تمام پجاریوں نے میرے راستوں میں گہرے گڑے کھودر کھے تھے۔ کہ ان میں گر جاؤں۔ اور ان کی روحانی تقویت کے جلا دیا جاؤں۔ اب میرے اندر سے کوئی مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ ہزاروں وہ چیزیں میری منتظر ہیں۔ جنہیں میں نے پوجا کے جوش میں کبھی غور سے دیکھا۔ نہ چکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آج پیدا ہوا ہوں۔ اور میں نے بہت جینا ہے۔ تاکہ میں زمین پہ آزادی اور طاقت سے ان تمام مقامات تک جا سکوں۔ جہاں پہ کل جاتے ہوئے میں ڈرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی پرکشش جوان عورت کی طرف ہاتھ موڑتے ہوئے کہا۔ چلو آؤ میں تمہیں ساتھ لیے چلتا ہوں۔ کیا میں سونے کے موتیوں اور ہیروں سے ایک مٹھی بھر لوں، عورت مچلتے ہوئے بولی۔ نہیں نہیں۔

وہ سختی سے بولا، اگر ہم نے یہ چیزیں اُٹھالیں تو پھر ہمیں اُن لوگوں کا محتاج ہونا پڑے گا جنہوں نے اس کی قیمت مقرر کر رکھی ہے اور پھر جو کچھ ہم نے پالیا ہے وہ ہمارے پاس نہیں رہے گا۔ دریا کے کنارے پہ میری کشتی کھڑی ہے۔ اس میں تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔ دریا چڑھا ہوا ہے لیکن اب مجھے پانیوں کا خوف نہیں رہا۔ ہم دریا کے تیز بہاؤ میں کشتی ڈال کر دور نکل جائیں گے اس نے کلہاڑی کو ہتھیار کی طرح مضبوطی سے تھام لیا اور سخت سردی کی وجہ سے تھکے ہوئے کتوں کی بار بک بھونکار کی پروا کیے بغیر وہ اور اسکی نئی عورت کشتی میں جا بیٹھے اور پھر اُنہیں یوں لگا جیسے دریا کا تیز بہاؤ ان کی کشتی کا ہی منتظر تھا۔

☆☆☆☆☆

اکلوتا وارث

انسان کی مٹی کو پانی سے خمیر کیا گیا ہے۔ اِس مخلوق کو ''احسن تقویم'' کہا گیا ہے۔ جب یہ انسان بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے تو پایا عرش کو چھو لیتا ہے اور جب گرنے پہ آئے تو ''اسفل السافلین'' کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟---- آخر وہ اتنی پستی میں کیوں جا گرتا ہے؟ انسانوں کی مٹی ایک اور جس مٹی سے اسے مخلوط کیا گیا وہ پانی بھی ایک تو پھر اس انسان کے رویے اتنے مختلف کیوں ہیں۔ میرے ذہن میں ایک سوال جنم لیتا ہے کہ جب یہ مقام علیین تک پہنچ جانے والا پتلا، پستیوں کی طرف رُخ پھیرے تو کتنا گر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ڈھونڈنا میرے خیال میں خاصا مشکل ہے۔ اگر مختلف لوگوں سے اِس سوال کا جواب پوچھا جائے تو جوابات یقیناً مختلف ہوں اور عجیب بھی۔

گذشتہ دنوں ایک ایسا ہی واقعہ رُونما ہوا جس نے نہ صرف مجھے میرے سوال کا جواب دے دیا بلکہ میری آنکھیں بھی کھول دیں۔

رشید سوشل سیکورٹی کالونی میں رہتا تھا۔ وہ بہت محنتی تھا۔ اِس کالونی میں زیادہ تر فیکٹریوں میں کام کرنے والے درمیانہ درجہ کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ کالونی مین جی ٹی روڈ پر ہی واقع ہے۔ سوشل سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ کا خاص احسان کہ ہے مزدوروں کو فلیٹ الاٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ملازموں کو بہت معمولی رقم اقساط کی صورت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اقساط مکمل ہونے پر کچھ لوگ یہ فلیٹ ایک دوسرے کو بیچ بھی دیتے ہیں اور اسٹام فروش سے اسٹام پیپر اپنے نام کروا لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ فلیٹ کرائے پر بھی دیئے ہوئے ہیں۔ یہاں کے مکین سارا دن محنت مزدوری کرتے اور شام کو بستی بساتے ہیں۔ کالونی کے پلاٹوں کی کٹنگ کچھ ایسے ہے کہ چار چار مرلہ دو دو فلیٹ پشت کے بل آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور اِس طرح یہ قطار آگے بڑھتے ہوئے چالیس پچاس گھروں کا ایک بلاک بن جاتا ہے۔ دو بلاکوں کے درمیان پندرہ بیس فٹ چوڑا راستہ

نجم رضوی

ہے اور اِسی راستے کی سمت میں گھروں کے دروازے کھلتے ہیں۔ ہر بلاک کے ساتھ بچوں کے کھیلنے کے لئے چھوٹا سا ایک پارک بھی ہے۔ یہ فلیٹ کوارٹر کے نمبر کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں اور اُس کے مقیم کو اس کے نمبر سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ آنٹی تین۔ سی اور انکل اٹھ۔ اے والے وغیرہ وغیرہ۔

رشید اور اُس کی بیوی اسی کالونی میں رہ رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش تھے اگر پریشان ہوتے بھی تو اس وجہ سے ہوتے کہ ان کے ہاں بیٹا نہیں تھا۔ اُن کے ہاں پہلی بیٹی ہوئی تھی اُس کے دو سال بعد دوسری رحمت اور پھر تیسری اور چوتھی۔ آخری بیٹی بھی اب پانچ سال کی ہو گئی تھی۔ ہر کوئی دُعا گو تھا کہ کوئی اس کا بانہہ بیلی ہو--- کوئی تو اُس کی جائیداد کا وارث کہلائے۔ دنیا میں رشید کی بھی نشانی ہو۔ پھر معاملہ خدا سے مانگنے ---- سے بڑھتے بڑھتے شکوہ شکایت تک چلا گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اللہ پاک کو ڈھیر سارے واسطے دیتے ---- گڑگڑا کر تقدیر تبدیل ہونے کی دُعا کرتے۔ ضد کر کے اللہ سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے۔ وہ دعائیں کرتے ''یا اللہ! ہمارے گھر بھی کوئی اولادِ نرینہ ہو--- وہ روئے --- تو ہم اس کے ساتھ روئیں --- وہ ہنسے تو ہم سارے ہنسیں ---- ہمارے گھر بھی چراغ جلے --- روشنی ہو--- اے مالک! ہمیں بھی وارث دے--- اکلوتا وارث!!'' دوا اور دعاؤں کے ساتھ رشید کی مدد شروع ہوگئی۔ کوئی تعویز دے کر گیا تو کوئی دھاگہ۔ وہ وقت بھی آ گیا اور امید بھی بندھ گئی تھی۔ سب کی دوائیں اور دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ لگتا تھا کہ معجزہ رُونما ہو چکا۔ الٹرا ساؤنڈ نے یہ راز فاش کر دیا تھا کہ جس کا سب کو انتظار ہے اس دفعہ اُس بیٹے کی ولادت متوقع ہے۔ مسجد میں نذرانے بھجوائے جانے لگے۔ لوکل درباروں پر دیسی گھی کے دیپ جلائے گئے۔ آخر وہ نحس گھڑی آ پہنچی۔

وقتِ مقررہ پر رشید نے بیوی کو ہسپتال لے کر جانا تھا اس لئے جگمگاتے روشن چہرے کے ساتھ سڑک سے رکشہ پکڑ لایا۔ چاروں بچیوں نے ماں اور باپ کو خوشی خوشی الوداع کیا۔ وہ بضد تو بہت تھیں کہ ہسپتال ان کے ساتھ جائیں گی اور ماں کے ساتھ رہیں گی۔ وہ بھائی کے چاند چہرہ کو سب سے پہلے دیکھنا چاہتی تھیں۔ آخر باپ کے لاکھ سمجھانے پر کہ جیسے ہی بیٹا دنیا میں آتا ہے تو وہ خود آ کر بیٹیوں کو ہسپتال لے جائے گا اور اُن کا بھائی اُن ہی کی گود میں دے دے گا۔ باپ نے بیٹیوں کو سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے کوارٹر میں جانے پر راضی کیا۔ باہر سے مین دروازے پر تالا لگا دیا۔ بیٹیاں اندر اکیلی تھیں اور اُس نے چابی چھوٹی دیوار سے اندر اُن کے پاس پھینک دی۔

میاں بیوی رکشہ میں بیٹھ کر ہسپتال روانہ ہو گئے۔ وہ تو رکشہ میں بہت خوش ہو رہے تھے اور لڑکیاں گھر میں پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ راستہ میں وہ دونوں میاں بیوی مستقبل میں آنے والی زندگی --- بچہ اس کے ساتھ ڈھیروں خوشیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کبھی اُن کی کھسر پھسر میں تیزی آ جاتی اور کبھی کمی۔ رکشہ ڈرائیور بھی کبھی کبھار اُن کی سرگوشیاں سن لیتا تھا۔۔ ان ہی باتوں، یادوں اور منصوبہ بندی میں پینتیس چالیس منٹ گزر گئے اور وہ شہر کے مشہور ہسپتال پہنچ گئے۔

کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ بمشکل ہی گزرا ہوگا کہ وہی رکشہ اُسی کالونی میں آ کر دوبارہ رُکا۔ رکشہ ڈرائیور اُسی تالا لگے مکان تین۔ سی کے سامنے کھڑا آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ اندر سے یک دم اکٹھی آوازوں کے جواب میں ڈرائیور نے جواب دیا،"ہاں ---- میں ہوں رکشے والا انکل --- بیٹا! اللہ نے آپ کو بھائی دیا ہے۔ مبارک ہو! ماشاءاللہ بہت پیارا ہے --- گورا چٹا!! آپ کے بابا نے مجھے بھیجا ہے ------ جلدی جلدی ------ کہ آپ سب بہنوں کو ہسپتال لے آؤں۔ جلدی کریں --- آپ کے بابا --- آپ کی امی کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آ سکتے تھے ---- جلدی کریں ------ شاباش --- سامان پکڑو ------ ضروری ------ اور چابی پھینکو --- باہر سے تالا کھولوں ------!!"

بچیاں تو جیسے اُچھل پڑیں جیسے وہ اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہ پچھلے کمرے کی طرف بھاگیں اور پانچ منٹ میں --- پانچ منٹ بھی بہت زیادہ تھے، اپنی اپنی چھوٹی چادریں اور دوپٹے سنبھالے، تیار ہو کر چابی باہر رکشے والے انکل کی طرف پھینکی۔ آناً فاناً رکشے میں آ بیٹھیں۔ رکشے والا، رشید کے دروازے پر تالا لگا کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

دن کے بارہ بج رہے تھے۔ سورج فضا میں اٹکا اٹکا محسوس رہا تھا۔ سائے دھندلے دھندلے سے لگ رہے تھے۔ رشید کے ہاں بیٹے کی ولادت ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ ضروری انتظام کر کے بیٹیوں کی خوشی اور بے قراری کو ذہن میں تصور، نرس کو تاکید کرتے ہوئے اور جلدی واپسی کہہ کر، اپنے گھر بیٹیوں کو لینے نکل پڑا تھا۔ اُس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹیوں کے لیے مٹھائی پہلے لے یا اُڑ کر گھر پہنچ جائے۔ رش کا وقت تھا۔ بمشکل گھنٹہ بھر میں وہ اپنے کوارٹر کے باہر کھڑا دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ پریشانی میں دستک پہ دستک اور بیٹیوں کو آوازیں دیئے جا رہا تھا۔ قفل شدہ دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ آخر مجبور اور بے قرار ہو کر اُس نے ساتھ والے کوارٹر کے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد چار۔ سی سے آنٹی نکل آئیں۔ اُنہوں نے رشید کو پریشان دیکھ کر آنکھوں میں خوشی کے

دیپک جلاتے ہوئے پوچھا، ''رشید بھائی! خیر تو ہے ---؟؟ بڑی عجلت میں لگ رہے ہو''
''جی باجی! ----! اللہ میاں نے بیٹا دیا ہے!! --- بھاگا بھاگا آیا ہوں ---- ہسپتال میں بیوی اکیلی ہے! بیٹیوں کو لینے --- بچوں کی ماں نے ہی بھیجا ہے ------ 'میری بیٹیوں کو لے آؤ ---- بھائی کو سب سے پہلے وہی دیکھیں۔ ---!!!' رشید کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں لیکن ساتھ ساتھ آنکھوں میں حیرانی اور خوشی کی آمیزش بھی تھی۔ آنٹی نے بڑا حیران ہوتے ہوئے کہا، ''گلی کے بچے بتا رہے تھے ---'' آنٹی نے بڑی مشکل سے کسی ہسپتال کا نام سوچتے ہوئے، بتایا ''ہسپتال سے کسی کو اپنی بچیوں کو لینے بھیجا تھا --- شاید کوئی رکشے والا تھا --- بچیاں تو فوراً بھاگ کھڑی ہوئیں ---- کسی کو بتایا بھی نہیں ---!!'' پھر کیا تھا --- رشید کو ہزار وولٹ کا جھٹکا لگ چکا تھا۔ مقدر کی دیوی یکدم روٹھ چکی تھی۔ پل بھر میں قیامت اُس کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ ساری بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ رشید کا وجود کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ یکدم پیلا پڑ گیا۔ اُس کی نس پھٹ چکی تھی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سڑک پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ محلے کے لوگ اس کے گرد جمع ہو چکے تھے اور اس کے منہ میں پانی ڈال رہے تھے۔ سارا معاملہ اُن کی پہنچ سے باہر تھا۔

رشید کی بیوی سے جب تک ممکن تھا سب کچھ چھپایا گیا۔ آخر جب مزید کچھ چھپانا ناممکن ہو گیا تو بڑی حکمت سے ڈاکٹروں نے اُس بدنصیب کو سارا سنا دیا گیا۔ پیٹ پیٹ کر اُس کا جسم نیلا کالا ہو۔ دنیا بھر کی بددعائیں اُس رکشے والے کو دے دی گئیں۔ جب تک ہمت رہی رشید کی بیوی تڑپتی رہی۔ جیسے ہی اُس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ نیم بسمل پرندے کی طرح ہسپتال کے بیڈ پر گر پڑی۔ کچھ عرصہ اُس کا بے ہوشی میں گزر گیا۔

اگلے کوئی دس پندرہ دنوں میں رشید کے گھر کا منظر بالکل بدل چکا تھا۔ وہ وفات پا چکا تھا۔ ضروری ضروری رشتے دار افسوس کر کے جا چکے تھے۔ بچیوں کی کھوج کا کام تقریباً ناکام ہو چکا تھا۔ رشید کی بیوی اپنی بچیاں کھو چکی تھی ---- وہ سارا سارا دن اُن کو یاد کر کے سسکیاں بھرتی رہتی تھی۔ اُس کی اپنی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔ وہ نیم مردہ عورت نیم پاگل محسوس ہوتی۔ صحن کے درخت ''دھریک'' کے سائے میں لیٹی ایک لاغر ضعیفہ لگ رہی ہوتی اُس کے سر پر بھاری پٹی بندھی رہتی تھی۔ اُس کے ارد گرد مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں۔ چند رشتہ دار عورتیں اِدھر اُدھر چارپائیوں پر لیٹی رہتی تھیں۔ بچہ ---- اُس کا بچہ ---- گھر کا اکلوتا وارث --- اُس کی بے جان سی چھاتی سے چمٹا دودھ کشید کر رہا ہوتا۔ رشید کی بیوی کو لگتا کہ جیسے وہ اُس کے جسم سے سارا خون چوس جائے گا۔

☆☆☆☆☆

کھیل

سڑک کے دونوں طرف گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ دور پار کے رشتہ دار اپنی اپنی گاڑیوں میں لد کر آئے ہوئے تھے۔ رش کی وجہ سے شہر کے تنگ بازار میں عام ٹریفک کے گزرنے کے لیے کم ہی جگہ بچی تھی۔ آج مکرم خان کی منگنی شہر کے مضافاتی علاقے میں ہونے جارہی تھی۔

دھان پان بے روزگار مکرم خان ماں باپ کا راج دلارا تھا اس لیے لڑکی والے بھی اس رشتے پر بہت خوش تھے۔ مکرم خان آف وائٹ لباس کے اوپر ہلکی نیلی فتوحی پہنے بڑا جچ رہا تھا۔ وہ حجرے میں بیٹھے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ آج کا دن اس کے لیے مستقبل کی ان گنت خوشیوں کا آغاز تھا؛ وہ خوشیاں جن کا ادراک عنفوانِ جوانی سے ہر نوجوان کو ہوتا ہے؛ ٹھنڈی، میٹھی، بانکی، حیات آگیں خوشیاں۔

کہنے کو تو یہ منگنی تھی مگر مظاہر سے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی زردار کی شادی کا جلوس ہو۔ مغرب کی اذانوں سے ذرا پہلے خواتین زرق برق لباسوں میں ملبوس گاڑیوں میں بیٹھ گئیں۔ مرد اور لڑکے اپنے لیے مختص گاڑیوں کی طرف لپکے اور شادی کا یہ شاندار جلوس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔

کچے پکے مکانات پر مشتمل ایک بستی، جو شہر کے مضافات میں واقع تھی، ہماری منزل تھی۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے ایک مکان خالی کرایا گیا تھا جہاں نکاح کے بعد ان کی خاطر تواضع کی گئی۔ مبارک سلامت اور فوٹو سیشن کے بعد ہمارے قافلے نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور بخیر و عافیت مقامِ آغاز پر پہنچنے کے بعد رشتہ دار مہمانوں اور یار دوستوں نے اپنے اپنے آشیانوں کا رخ کیا۔

منگنی کے دن سے دونوں گھرانوں میں حسبِ روایت آمد و رفت اور تحفہ تحائف کے تبادلوں سے یہ بات واضح تھی کہ لڑکے اور لڑکی کے ساتھ ساتھ جانبین کے دیگر افراد بھی اس نئے بندھن سے خوش اور نہال ہیں۔ مقامی رواج کے مطابق منگنی ہونے کے بعد لڑکا لڑکی کے ملنے پر پابندی تھی۔ مگر لڑکی کے ہونے والے سسر زاہد خان کی آزاد طبیعت اور فطری سادگی کو قرار نہیں تھا۔

عزیز عادل

وہ اپنی ہونے والی بہو کے لاڈ پیار میں اس قدر مست تھا کہ زمانے کی چال یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ صبح دیکھتا تھا نہ شام، بہو کی خبر گیری کے لیے سدھیانے کا روزانہ کا چکر لگانا اس نے اپنا جزوِ حیات بنا لیا تھا۔ ادھر سے بہو کوئی فرمائش کرتی ادھر سے زاہد خان پوری کرنے میں جی جان سے جت جاتا۔ موبائل فون کی بیل پر اس کے کان ہمہ وقت لگے رہتے تھے۔ اکثر وہ خود بھی سدھیانے فون کرنے کا بڑا دھیان رکھتا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ ماحول پر سے دھند کی چادر سرک چکی تھی اور سورج کی خوشگوار تمازت جسموں کو ٹکور رہی تھی۔ زاہد خان گھر کی چھت پر دھوپ سینکتا، سوچ میں گم چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک فون پر بیل آنے لگی۔ اس نے اپنے واسکوٹ کی جیب میں ہاتھ مارا اور موبائل نکال کر دیکھا تو اس کی سدھن کا فون نمبر سکرین پر دمک رہا تھا۔ وہ لکھا پڑھا نہیں تھا مگر نمبر شناسی اور نمبر ملانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بٹن دبا کر اس نے کال وصول کی۔

”ماموں جان! السلام علیکم ----“ بہو کی کھنکتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہو فضیلہ بیٹیا؟ لالہ بشیر اور تمھاری ماں کیسی ہے؟“

زاہد خان کے چہرے پر رونق آ گئی۔

”ماموں جان! میں ٹھیک ہوں۔ ابو بھی ٹھیک ہیں۔ امی اور ابو دونوں صحن میں بیٹھے آپ ہی کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھی ہوں۔ امی کہہ رہی ہیں: ماموں سے کہہ دو کہ یہاں آ جائیں۔ اگر آپ آ رہے ہیں تو میرے لیے چوک سے قیمے والے برگر بھی ساتھ لیتے آئیں۔ آج گھر کا سالن مجھ سے نہیں کھایا جا رہا۔“

فضیلہ کی آواز میں پژمردگی سی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں لے کر آتا ہوں۔“

زاہد خان نے دو چار باتیں کرنے کے بعد لائن منقطع کر لی۔ اس نے پیر اپنے کالے بوٹوں میں گھسیڑے، گرم چادر اوڑھ کر سیڑھیاں اُتری اور کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل پڑا۔ ایک محلے دار سے موٹر سائیکل مانگی اور چوک سے قیمے والے برگر مع چٹنی کے خرید کر سدھیانے کے گھر میں داخل ہوا۔

لالہ بشیر نے، جو حال ہی میں ٹانگ کے آپریشن کی وجہ سے چارپائی نشین ہو چکا تھا، ذرا سی کمر سیدھی کر کے اس کا استقبال کیا۔ سدھن نے باورچی خانے سے باہر آ کر اسے خوش آمدید کہا۔ پاس ہی بچھی چارپائی پر زاہد خان بیٹھ گیا اور دونوں سدھی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔

فضیلہ چھت کی چار دیواری سے تھوڑا سا سر اوپر اٹھائے دو تین گھر دور کی چھت پر نظریں جمائے ہوئی تھی جہاں محلے کا ایک خوش رو نوجوان کھڑا تھا۔ لڑکے نے سبز رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ وہ گردن تھما کر کبھی کبھار اس گلی کی طرف دیکھنے لگتا جہاں ایک دروازے کا چوبی چوکور گھیرا نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے سینے پر دل کے مقام

پر ہاتھ رکھ کر دل کی بے قراری کا انداز بناتا اور کبھی اپنے ہونٹوں کو دو انگلیوں سے چھو کر فضیلہ کی سمت ہوائی بوسے اچھالتا۔ اشاروں کی زبان میں دونوں کے بیچ گفتگو جاری تھی۔ فضیلہ کا یہ معاشقہ بڑے عرصے سے چل رہا تھا مگر ابھی اس کی بھنک گھر کے کسی بڑے کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ یہ اور بات کہ محلے کی بعض خواتین نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس امر کی نشان دہی فضیلہ کی ماں کو کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے کان تو جیسے پیدائشی طور پر بند اور آنکھیں بصارت سے عاری تھیں یا پھر وہ جان بوجھ کر بہری اور اندھی بن گئی تھی۔ فضیلہ کے تیز کانوں میں گاہے گاہے صحن کی آوازیں پڑ رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کا ''ماموں جان'' بھی آن موجود ہے مگر ابھی وہ اپنی گونگی ملاقات مختصر کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کچھ دیر آنکھ مٹکا کرنے کے بعد وہ چھت سے اتر آئی اور ماموں کو سلام کیا۔ زاہد خان نے اس کا حال چال پوچھا اور اسے دعائیں دی۔

''فضیلہ! اس میں تمھاری فرمائش موجود ہے۔ یہ لو! کھاؤ اور خوش رہو۔''

زاہد خان نے بڑے ہشاش لہجے میں کہتے ہوئے پاس پڑا شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے لپک کر شاپر پکڑا اور باورچی خانے میں جا گھسی۔

تھوڑی دیر بعد فضیلہ باورچی خانے سے نکلی اور آ کر اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق اس سے ہنسی مذاق کرنے لگا اور وہ تریا چرتر اپنے سادہ مزاج سسر کو اپنے قول و عمل کا شکار بناتی رہی۔ چھت پر سے سکھانے کے لیے ڈالے گئے کپڑے اتار لانے کا بہانہ بنا کر وہ عام انداز میں اوپر چلی گئی اور زاہد خان بھی گلی میں کھڑی موٹر سائیکل کا پتا کرنے باہر نکلا۔ موٹر سائیکل دیکھ کر وہ واپس آیا اور لالہ بشیر سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

کچھ وقت گزرا تو فضیلہ کی امی نے زاہد خان سے کہا کہ فضیلہ اُسے چھت پر بلا رہی ہے۔ وہ اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔

فضیلہ بال کھولے ایک پرانی میز کے نزدیک پنجوں کے بل اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ کنگھی اس کے ہاتھ میں تھی جبکہ اس کا دوپٹہ دیوار پر دھرا ہوا تھا۔ منظر بڑا خوش کن تھا مگر زاہد خان کا مذاق تو صاف ستھرا زبانی کلامی حد تک تھا۔ اس سے آگے اس کے ذہن کا کاغذ خالی تھا۔

''ماموں جان! ذرا میرا دوپٹہ تو لا کر دیں۔''

فضیلہ نے زاہد خان سے شہد بھری آواز میں کہا۔ اس نے دیوار سے دوپٹہ اتار کر فضیلہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ دوپٹہ ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس کے اندر کی چالاک فضیلہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

اچانک فضیلہ، زاہد خان سے کہنے لگی

''ماموں جان! کیوں نہ آج ہم کوئی کھیل کھیلیں۔ اگر آپ مان جائیں تو—''

زاہد خان حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ حیرت

کے ساتھ اسے تھوڑی سی پریشانی بھی ہونے لگی۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ وہ فضیلہ کے ساتھ چھت پر اکیلا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر آج تو فضیلہ کے رنگ ڈھنگ ہی اور تھے۔ اس کا دل انکار کرنے کو تو بہت چاہا مگر ہونے والی بہو کا دل توڑنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ اس کی بیٹی نہ سہی مگر بیٹیوں جیسی تو تھی ہی اور پھر آخر کو اس کے راج دلارے بیٹے کی ہونے والی دلہن بھی تو تھی۔

"کھیل۔۔۔!! کیسا کھیل؟" زاہد خان نے رسمی انداز میں پوچھا۔

"اس کا مت پوچھیں ماموں جان۔۔۔! بس آپ کو ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا میں کہوں گی۔ کہیے، کھیلیں گے نا!" فضیلہ نے اٹھلا کر کہا تو اس نے بادلِ ناخواستہ ہامی بھر لی۔

زاہد خان نے فضیلہ کے کہنے پر اسی کے دوپٹے سے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ پھر وہ چھت پر لیٹ گئی اور مونج کی پرانی رسی سے اس سے اپنے پیر بندھوائے۔ فضیلہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ کسی ماہر ہدایت کارہ کی طرح اپنی مہارت کے جوہر دکھا رہی تھی۔ زاہد خان بھی ایک تابع دار معاون کی طرح اس کی ہدایت پر عمل پیرا تھا۔ "اب وہ میز پر رکھا ہوا کپڑا اٹھا لیں اور میری آنکھوں پر باندھ لیں۔" فضیلہ کی ہدایت کے مطابق وہ یہ بھی خاموشی سے کر گزرا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ زاہد خان کا دل اب اس کھیل سے کچھ اکتانے لگا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ ظاہر ہے کوئی بھی کھیل کھیلنے کے لیے دوسرے بندے کا ہونا ضروری ہوتا ہے، سو اسے بھی کھیل میں ساتھ تو دینا تھا۔

"بس اک آخری کام اور۔۔۔ اب مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر میز پر لٹا دیں۔"

فضیلہ کی اس بات سے زاہد خان کی حیرت و پریشانی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ اس جیسے بھلے مانس کے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ تھا جس سے وہ کنی کترا بھی سکتا تھا مگر انسانی فطرت کے تحت کوئی انجانہ جذبہ یا احساس غیر ارادی طور پر اس سے یہ سب کچھ کروانے پر مائل کر رہا تھا؛ کسی مرد کا کسی عورت کی قربت کی خواہش یا اسے چھو لینے کا خیال۔

اس نے جھک کر ایک ہاتھ فضیلہ کے بندھے ہوئے پیروں اور دوسرا اس کی گردن کے ذرا نیچے سے گزارا اور اٹھا کر میز کی طرف لے جانے لگا۔ میز تک سیدھا پہنچنے کیلئے مونج کی پرانی رسیوں کے ڈھیر کے اوپر سے گزرنا مشکل تھا اس لیے اسے گھوم کر فضیلہ کو میز پر لٹانا پڑا۔ فضیلہ کو لٹا کر جوں ہی زاہد خان نے کمر سیدھی کی، اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ اس کی نگاہ چاردیواری کے اوپر سے جھانکتے ہوئے موبائل فون پر پڑی جسے ایک ہاتھ نے تھاما ہوا تھا اور جس کے سکرین پر ویڈیو ریکارڈنگ کا سرخ دائرہ دور سے بھی اصاف دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

غزل

سبھی آنکھیں ہیں ، ہماری آنکھیں
گھُل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

ابھی بینا ہیں ، ابھی نابینا
کیا کریں نیند کی ماری آنکھیں

دیکھنا چاہیں تو چھُو لیتے ہیں
اب تو پوریں ہیں ہماری آنکھیں

جانے کِس رَو نے بُجھا ڈالی ہیں
جانے کس دُھن میں تھیں ساری آنکھیں

شمعِ پیمانِ وَفا کی صورت
جَل بُجھیں نُور سے عاری آنکھیں

دل کسی اَوٹ کسی گھاٹ رہیں
جان لیتی ہیں شکاری آنکھیں

تم کو پہچان گئے ، جان گئے
اب یہ آنکھیں ہیں ، تمھاری آنکھیں

ایک عادت ہے ، عبادت خالد
کچھ تو پُوجیں گی پجاری آنکھیں

خالد احمد

غزل

کچھ زہد میں نظروں سے گرائی نہیں دنیا
سچ یہ ہے ہمیں راس ہی آئی نہیں دنیا

دیکھو کبھی اِن فقر کے پردوں کو ہٹا کر
ہے کون یہاں جس نے کمائی نہیں دنیا

ہوتا ہے یہاں آپ کی مرضی کے سوا بھی
کچھ آپ نے کاندھوں پہ اٹھائی نہیں دنیا

تعبیرِ معانی سے نکھرتی ہے کہانی
بس حرف و عبارت کی پڑھائی نہیں دنیا

رہتے ہیں کہاں منصبِ انساں کے سزاوار
دنیا سے اگر ہم نے بچائی نہیں دنیا

اُس عکس گرِ ہست کو شاعر کہیں کیسے
لفظوں میں جدا جس نے بسائی نہیں دنیا

عالی گئی بے کار ہی یہ مہلتِ ہستی
پہلے سے کچھ آگے جو بڑھائی نہیں دنیا

جلیل عالی

غزلیں

نہیں رہی خود پہ کچھ تمہیں دسترس، یہی نا
اُلجھ گئے ہو میانِ عشق و ہوس، یہی نا ؟
رِہائی پائیں گے جان دے کر ہی، بس یہی نا؟
یہ زندگی ہو چکی ہے ہم کو قفس ، یہی نا؟
ہر آئنے میں ہیں عکس اپنی شکستگی کے؟
یہی تماشا ہے سامنے اپنے، بس یہی نا؟
سماعتوں میں بھرا ہوا ہے سکوتِ سیسہ
سنائی دیتی نہیں صدائے جرس، یہی نا
تُمہاری جانب سے اب بھی اصرار ہو رہا ہے!
اُدھر سے اب تک مگر وہی پیش و پس، یہی نا؟

اُداس اِتنے جو آمدِ سالِ نو پہ ہو تم
تو مِل نہ پاؤ گے کیا اُسے اِس برس، یہی نا ؟
یہاں تو کوئی کسی کا بھی ہم نفس نہیں ہے
یہ تلخ سچائی ہے مِرے ہم نفس، یہی نا ؟
نسیم ہونے میں اور نہ ہونے میں فرق ہے کیا ؟
کہ جو بھی حاصل ہوا وہی ہے عبث، یہی نا ؟

نسیمِ سحر

کشتِ جاں میں جو بے کلی سی ہے
شاخِ غم کوئی اَدھ جلی سی ہے

وہ جدا ہو کے بھی جدا ہے کہاں!
اُس کی فرقت بھی ہم جلیسی ہے

عشق میں بے کنار ہو گیا مَیں!
ہر گلی اب تِری گلی سی ہے !!

کون دیوانہ اپنی جاں سے گیا؟
چارسُو کیا یہ کھلبلی سی ہے !

خار جس رہگذر میں اُگتے ہیں
آبلہ پا کو مخملی سی ہے

حبس موسم میں اُس کی یاد آئی
جیسے پُروا کہیں چلی سی ہے!

حُسن میں بے مثال ہے وہ نسیم
دیکھنے میں جو سانولی سی ہے

غزل

کہنے کو مطمئن ہیں مگر مطمئن نہیں
ہم صاحبانِ فکر و نظر مطمئن نہیں

ہر سمت ہم چلے ہیں مگر بے دلی کے ساتھ
اب تک ہیں گرچہ گرمِ سفر مطمئن نہیں

گلچیں ہوا ہے گل کا نگہبان ان دنوں
گلشن میں اب نسیمِ سحر مطمئن نہیں

یہ اہتمامِ جشنِ بہاراں بھی خوب ہے
لیکن مرا مذاقِ نظر مطمئن نہیں

مدت سے سرنگوں ہیں یہاں صورتِ قلم
کہیے نہ کیسے اہلِ ہنر مطمئن نہیں

سرخوش ہیں جو حصارِ وسائل میں ان دنوں
دل میں کسی کا رہتا ہے ڈر مطمئن نہیں

تسکینِ دل کسی کو میسر نہیں حسن
زردار ہو کہ خاک بسر مطمئن نہیں

حسن عسکری کاظمی

غزل

دم کو ذرا سنبھال کے رکھنا ضرور ہے
اے غم کے پل صراط! گزرنا ضرور ہے

پھر آندھیاں نہ در پئے آزار ہو سکیں
طائر کو آشیاں میں سنبھلنا ضرور ہے

ضعفِ یقیں کو راہ کی دیوار مت بنا
وارفتگی سے راہ پہ چلنا ضرور ہے

یہ آفتابِ تازہ کی کرنوں کا فیض ہے
وقتِ سحر چراغ کو بجھنا ضرور ہے

مہرِ فلک کا چہرۂ پُرنور دیکھ کر
شبنم کے موتیوں کو چمکنا ضرور ہے

اچھا ہے انگ انگ میں جدت اُتار لیں
ماضی کا بھی نگاہ میں ہونا ضرور ہے

پامال رہ گزر پہ قدم ڈگمگائیں گے
چالیس بدل کے راہ بدلنا ضرور ہے

اک دل نشیں جھلک بھی سرِ بام آئے گی
گل کو درِ ہنر سے اُبھرنا ضرور ہے

بے شک رہِ حیات میں ظلمت بھی آئے گی
جگنو کو کنجِ دل میں دمکنا ضرور ہے

افزائشِ نمو جو نہیں ہے تو کیا ہوا
چاہت کے نغمہ زار کو کھلنا ضرور ہے

ہم کو ریاض دائی رشتہ عزیز ہے
ہر ماسوا کا دل سے اُترنا ضرور ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

جذبے پاکیزہ ہوں تو شہ پارے ہو جایا کرتے ہیں
آنکھیں روشن ہوں تو لفظ ستارے ہو جایا کرتے ہیں

لہجہ میٹھا ہو تو کڑوی بات بھی میٹھی ہو جاتی ہے
دشمن بھی دشمن نہیں رہتے، پیارے ہو جایا کرتے ہیں

سوچ کے پنچھی فضا میں اُڑنے، پلٹیاں کھانے لگ جاتے ہیں
فکر و خیال کے سارے رنگ غبارے ہو جایا کرتے ہیں

من کی جھیل میں جس لمحے کھل اُٹھے رجائیت کا کنول
تنگیٔ داماں کے باوصف گزارے ہو جایا کرتے ہیں

جیسے بیچوں بیچ سمندر کوئی جزیرہ نظر پڑے
ڈوبنے والوں کو دو نین کنارے ہو جایا کرتے ہیں

راتوں کو چھپ چھپ کر تو رو لو گی، پر اِتنا یاد رہے
تنہائی کے آنسو خبر شمارے ہو جایا کرتے ہیں

جب گلیوں میں شور بپا ہونے لگ جائے، جانِ انیس!
فلک سے عہدِ زوال کے صاف اِشارے ہو جایا کرتے ہیں

محمد انیس انصاری

غزل

تنہایوں کے روگ کی شافی دوا لگا
اک اجنبی سا شخص بھی معجز نما لگا

ساحل پہ لائے کشتیاں طوفاں کے باوجود
وہ ناخدا بھی صورتِ فضلِ خدا لگا

یکجائی قلب و ذہن میں ہے اُس کے واسطے
دل ہی نہیں دماغ بھی اُس پر فدا لگا

انسان ہے فرشتے سے بہتر اِسی لیے
جس کو بھی جی کا دکھ ملا درد آشنا لگا

ہرچند کوئی مشق بھی میری نہ تھی مگر
نکلا کماں سے تیر نشانے پہ جا لگا

زنجیر جس کے پاؤں میں ڈالی فراق نے
خوشیوں کے ساتھ وقت وہی برق پا لگا

گلزار اتفاق بنا حُسن اتفاق
وہ حسن بے مثال بھی سینے سے آ لگا

گلزار بخاری

غزلیں

تری گلی سے گذرنا محال کرتا ہُوا
مَیں تجھ تک آیا رقیبوں سے چال کرتا ہُوا

غمِ حیات! تجھے اَب خبر ہُوئی جب مَیں
گذر گیا ہُوں ترا اندمال کرتا ہُوا

وہی خموشی ، وہی ایک چپ ہمیشہ کی
مَیں ہانپ جاتا ہُوں خود سے سوال کرتا ہُوا

عدو کی یورشِ پیہم سے بچ نکلتا ہُوں
ہر ایک جنگ میں سینے کو ڈھال کرتا ہُوا

اُٹھا تھا صبحِ ازل جھومتے ہُوئے اور اَب
چلوں گا شامِ ابد تک دھمال کرتا ہُوا

خاور اعجاز

اِک آہِ سرد سے سینے کا داغ ٹھنڈا ہُوا
ہوائے درد چلی اور چراغ ٹھنڈا ہُوا

بھڑک رہا تھا بدن جوشِ آتشِ گل سے
پھر ایک روز اچانک یہ باغ ٹھنڈا ہُوا

ابھی ہے گرمیِ حسنِ نظر کا ہنگامہ
کھلے گا ماجرا جونہی دماغ ٹھنڈا ہُوا

نکل ہی جائے گی دل سے وصال کی حسرت
جو یار گرم ہُوا اور ایاغ ٹھنڈا ہُوا

کہاں ملے گا نشاں واردات کا خاورؔ
کہ چوٹ سرد ہُوئی اور سراغ ٹھنڈا ہُوا

غزل [نذرِ اقبال]

گرفتِ پنجۂ آہ و فغاں سے دور نہیں
یقین کر کہ زمیں آسماں سے دور نہیں

دکھائی دیتا ہے اب تک غبار اڑتا ہوا
بچھڑ کے بھی میں ترے کارواں سے دور نہیں

مجھے جلا کے چمکنے سے خوش نہ ہو اتنا
کہ میری راکھ تری کہکشاں سے دور نہیں

جسے حضور سمجھتے ہیں آپ خلدِ بریں
مرے خیال میں کوئے بتاں سے دور نہیں

دلوں میں بغض کی کوئی خلیج ہے ورنہ
مکان اس کا تو میرے مکاں سے دور نہیں

زبانِ تیغ سے کرتے ہو گفتگو تو سنو
کہ میرا ہاتھ بھی اپنی کماں سے دور نہیں

قفس کا کیا ہے جہاں بھی پڑا رہے راحت
نگاہ میری مگر آشیاں سے دور نہیں

راحت سرحدی

غزل

بغیرِ حرف میں تحریر خلق کرتا ہوں
فقط نگاہ سے تصویر خلق کرتا ہوں

میں پیش کرتا ہوں خود اپنے دست و بازو کو
اگر کبھی کوئی زنجیر خلق کرتا ہوں

نہ جانے پھر یہی آنکھیں مری رہیں نہ رہیں
میں پہلے خواب سے تعبیر خلق کرتا ہوں

کئی ہدف اسے اپنی طرف بلاتے ہیں
ہدف بُھلا کے جو میں تیر خلق کرتا ہوں

لہولہان جو دیکھوں میں زیرِ دستوں کو
تو پھر کبھی کبھی شمشیر خلق کرتا ہوں

ہمیشہ عشق میں عجلت سے میں نے کام لیا
وہ جلد باز ہوں تاخیر خلق کرتا ہوں

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شام کا جادُو چل جائے گا
جبر کا سُورج ڈھل جائے گا

غزلیں

اب یہی التزام رکھنا ہے
کام سے اپنے کام رکھنا ہے

پہلے دل میں اسے سجانا ہے
پھر اسے صبح وشام تکنا ہے

دیکھیں کب آ کے چاندنی گھولے
اب تلک تو وہ چاند سپنا ہے

کیسے ڈھونڈیں گی منزلیں اس کو
جس نے ہر گام پر بھٹکنا ہے

دھوپ کا سائباں بنا کر پھر
اس کی چھاؤں میں جا کے تپنا ہے

احمد جلیل

میں یک طرفہ وفائیں کرتے کرتے
بہت ہی تھک گیا ہوں مرتے مرتے

کوئی تو ڈھونڈے منزل مجھے بھی
کہ رستے تھک گئے ہیں چلتے چلتے

وہ خوابوں سے نکل کر آ گیا ہے
اب اس کو دیکھ آنکھیں ملتے ملتے

عجب سا روگ بنتی جا رہی ہے
تمنا میرے دل میں پلتے پلتے

فرشِ مقتل پہ نقش بکھرے ہیں
جو ہے بسمل اسے تڑپنا ہے

جس سے عرفان اسکا ہو جائے
بے خودی کا وہ جام چکھنا ہے

جب تلک سانس آتی جاتی ہے
سینے میں دل نے بھی دھڑکنا ہے

چاہے اس نے بھلا دیا ہے ہمیں
پھر بھی اس کا ہی نام جپنا ہے

جب وہ نظروں کے سامنے ہو جلیل
آنکھ نے پھر کہاں جھپکنا ہے

تعلق کا بھرم رکھا ہے پھر بھی
ہے گزری چاہے آہیں بھرتے بھرتے

جلیل اس زلف کو ہی اب صدا دو
کہ سورج تو ڈھلے گا ڈھلتے ڈھلتے

تغافل گو جلیل عادت ہے اس کی
کریں گے شکوہ پھر بھی ڈرتے ڈرتے

غزل

دھوپ اور دھوپ کی شدت درویش
عمر کی لمبی مسافت درویش

آخری آنچ بھی بیکار گئی
کھوٹ ہی کھوٹ تھی نیت درویش

دل ہُمکتا تھا برابر پہلے
پڑ گئی صبر کی عادت درویش

بول پاتا نہیں حق میں اپنے
دور کر دیں مری لُکنت درویش

کانٹے اُگ آئے چٹائی میں مری
دیجے ہجرت کی اجازت درویش

یہ رہا قرض، یہ نقدِ جاں ہے
اب نہیں چاہیے مہلت درویش

ذائقے بھیجتی رہتی ہے مجھے
یہ جو دنیا کی ہے لذت درویش

میں ادھڑتا ہی چلا جاتا ہوں
مجھ کو بخیے کی ضرورت درویش

ڈولتے سانس کے اک تخت پہ ہوں
کر رہا ہوں یوں حکومت درویش

مجھ پہ اوقات کھلی تب میری
جب لگائی گئی قیمت درویش

قیوم طاہر

غزل

خلاصہ کرنا تھا تفصیل میں چلا گیا ہوں
کبھی میں چاند کبھی جھیل میں چلا گیا ہوں

میں ایک وعدے کی تکمیل کرنے آیا تھا
میں ایک حکم کی تعمیل میں چلا گیا ہوں

میں چاندنی کو اماوس میں ڈھونڈنے گیا تھا
اندھیری رات کی تحویل میں چلا گیا ہوں

نئے سرے سے پریشاں ہیں ہاتھیوں والے
میں کیسے دست ابابیل میں چلا گیا ہوں

کئی کہانیاں قصے وہاں ہیں پہلے بھی
اسی لیے تری زنبیل میں چلا گیا ہوں

وہ بچپنا یہ بڑھاپا سمجھ نہیں آتا
میں کیسے صوبے سے تحصیل میں چلا گیا ہوں

تمہیں تمہاری یہ فرعونیت ڈبو دے گی
میں آگے آگے ترے نیل میں چلا گیا ہوں

مسعود احمد

غزلیں

چراغِ شب پہ ہَوا کا ستم ہی ایسا تھا
چھلک پڑی تھیں یہ آنکھیں کہ غم ہی ایسا تھا

کسی بھی رُت میں نمو پا سکیں نہ تعبیریں
ہمارے خواب کی مٹی میں نم ہی ایسا تھا

جہاں جہاں بھی گئے اُس کو محترم رکھا
ترا خیال ہمیں محترم ہی ایسا تھا

نہ چُھو سکی تھی ہوس کی ہَوا کبھی ہم کو
ہمارے حال پہ اُس کا کرم ہی ایسا تھا

گذار دی ہے تحیّر میں زندگی ہم نے
ہمارے ہاتھ کی ریکھا میں خم ہی ایسا تھا

نثار ترابی

سیلِ رواں میں اب کے اُترنا تو سوچ کر
الزام میری ذات پہ دھرنا تو سوچ کر

لے جائے گی اڑا کے یہ پاگل ہوا تمھیں
خوشبو بنے ہوئے ہو بکھرنا تو سوچ کر

اب موسموں کا کوئی بھروسا نہیں رہا
اب آئنوں کے سنگ سنورنا تو سوچ کر

دشتِ فنا میں گرمیِ محشر ہے چار سُو
سورج کی روشنی میں ٹھہرنا تو سوچ کر

خود سے بھی پیار کرنا بہت احتیاط سے
دم اُس کی الفتوں کا جو بھرنا تو سوچ کر

اِس بار اے نثار قدم سوچ کر اٹھا
اس بار کوئی فیصلہ کرنا تو سوچ کر

غزل

شہر تک چھینا ہے مجھ سے دکھ بھرے جذبات نے
کر دیا مجبور ہجرت پر مجھے حالات نے

غم کی برساتیں رہی ہیں ساتھ میرے عمر بھر
چین سے رہنے دیا کب درد کی سوغات نے

حال ماضی اور مستقبل کی باتیں چھوڑ کر
کیا نہیں مجھ کو سکھایا میرے محسوسات نے

پر خطر سی ظلمتوں میں زندگی تھی مضطرب
خوف کو دل سے نکالا ہر اندھیری رات نے

درد کی ہر رات میرے رتجگوں میں ڈھل گئی
حوصلہ بخشا مجھے پھر اس خدا کی ذات نے

خامشی کا درس میں نے لے لیا درویش سے
نعمتیں بھی مجھ کو دیں پھر صبر کے ثمرات نے

ماں سے بڑھ کر وہ محبت مجھ پہ کر دی سب عیاں
رات کے پچھلے پہر چھائی ہوئی برسات نے

سر کا جب سنگیت سکھ کی راگنی میں ڈھل گیا
کیا سماں باندھا ہے پھر اقبال کے نغمات نے

اقبال سرو بہ

غزل

بارہا بات ہم نے دُہرائی
کوئی سمجھا نہ پھر بھی گہرائی

لَو نے مَرنے پہ تھا میں آمادہ
شاخِ زیتون اس نے لہرائی

چائے پی تھی جسے بھلانے کو
بھاپ میں اس کی شکل لہرائی

پیڑ کی طرح ہے محبت بھی
کیسے ماپو گے اس کی گہرائی

شہر کی رونقوں نے چھین لیا
وہ جو اجمل تھا کوئی صحرائی

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکل شکل زندانی ، سحرِ بے رُخی کی ہے
آرزوں کی بستی میں ، دھُوم سامری کی ہے

غزلیں

کہیں پہ گھومتا پھرتا، مرے قریں نکلا
وہ شخص دل کی زمینوں سے پھر نہیں نکلا

وہ چاند ایسا نہیں تھا کہ ہر نگاہ میں ہو
جہاں نکلنا تھا اس کو فقط وہیں نکلا

غلط تھا میں کہ مری ہی نظر درست نہ تھی
جو دل کی آنکھ سے دیکھا تو وہ حسیں نکلا

دکھائی دیتا رہا تھا جو دور پار کہیں
بغور دیکھا تو وہ روح کا مکیں نکلا

بدن کی دھول میں چلتے ہوئے وہ خوش تھا بہت
میں آسمان سمجھتا تھا، وہ زمیں نکلا

نکل گیا تو میں سمجھا کہ جا چکا ہے کہیں
پلٹ کے دل میں جو دیکھا تو وہ یہیں نکلا

وہ خوب سوچ سمجھ کر فدا ہوا نیرؔ
جو بے خبر نظر آتا تھا، دور بیں نکلا

شہزاد نیرؔ

بھٹکتی آنکھ، مقید نظر سے افضل ہے
میں دشت دیکھ کے بولا، یہ گھر سے افضل ہے

بتاؤ ایک ہی چوکھٹ کے تنگ نظروں کو
ہماری دربدری ان کے در سے افضل ہے

خدا رکھے مری بیٹی ہے سائبان مرا
گھنی دھریک کا سایہ ثمر سے افضل ہے

جلا کے راکھ بھی کر دے تو اعتراض نہ کر
جو خاک عشق بنائے وہ زر سے افضل ہے

مصیبتوں کو سہیں گے تو حل بھی سوچیں گے
سو اپنی دھوپ پرائے شجر سے افضل ہے

دروغ و کذب کو دیکھا تو صدقِ دل سے کہا
یہ اپنی بے خبری ہر خبر سے افضل ہے

بجا کہ زر کو زمانے میں اعتبار ملا
فقیر اب بھی ہر اک معتبر سے افضل ہے

غزل

گلتی نہیں تھی دال مگر آج گل گئی
جب گل گئی تو پیار کی رُت ہی بدل گئی

تنہا کیا ہے فکر نے کس کھوج میں مجھے
سوئے ابد گئی ہے کہ سوئے ازل گئی

دن رات اک ہجوم انھیں کھینچتا رہا
پہلے گئیں کہانیاں اور پھر غزل گئی

پکڑا ہوا کا ہاتھ تو نکلی دھویں کی چیخ
اس رات تو دیے کی عجب لَو مچل گئی

بسکٹ کے ساتھ چائے کے جیسے ہیں دُکھ مرے
اس چشمِ نم میں زندگی ساری پگھل گئی

جانے دیا نہ خواب کے کوچے میں رات نے
پلکوں پہ جاتے جاتے مگر نیند مل گئی

پھر اُس کو بھا گئے ہیں یہاں پھول تتلیاں
ہم پر بنی ہوئی تھی جو مشکل وہ ٹل گئی

سوچا تھا اب کی بار یہ میدان مار لیں
اس کی گلی کے موڑ پہ نیت سنبھل گئی

اعجاز روشن

غزل

تعبیروں سے خواب نکالا کرتی ہوں
جینے کے اسباب نکالا کرتی ہوں

بہنے دیتی ہوں کشتی کو دھاروں پر
دریا سے گرداب نکالا کرتی ہوں

رات اندھیری ہونے پر ٹل جائے تو
جھیلوں سے ماہ تاب نکالا کرتی ہوں

بارش ہو اور تنہائی بھی مل جائے
آنکھوں سے سیلاب نکالا کرتی ہوں

بچوں کے سب پھٹے پرانے بستوں سے
پھول ، دھنک ، سُرخاب نکالا کرتی ہوں

بستی کی آنکھوں میں بھر کر اُمیدیں
ٹوبے اور تالاب نکالا کرتی ہوں

دُنیا کی Pessimistic تحریروں سے
باہر دُکھ کے باب نکالا کرتی ہوں

شبہ طراز

غزلیں

تیز تر سے بھی تیز چاہئے تھا
عشق ہنگامہ خیز چاہیے تھا

دشمنوں سے ملا کے ہاتھ ہمیں
دوستوں سے گریز چاہیے تھا

میں نے غربت میں آنکھ کھولی تھی
اس کی ماں کو جہیز چاہیے تھا

کچھ لغت سے ہی دیکھ لینا تھا
چاہیے تھی ؟ کہ میز چاہیے تھا

اس تعفن بھرے زمانے میں
ایک پل عطر بیز چاہیے تھا

آنکھ جھکنے کے ساتھ حد ادب
عکس بھی سجدہ ریز چاہئے تھا

پھر سے رخشندہ غور کر لیجیے
شعر اک معنی خیز چاہئے تھا

رخشندہ نوید

خوف کا شہر ہے اور شہر بدر ہوتے ہی
مار ڈالوں نہ کسی کو میں نڈر ہوتے ہی

کھل کے جینے میں یہی خوف خلل ڈالتا ہے
ایک رات اور ہے یہ رات بسر ہوتے ہی

ان پرندوں کا کوئی اور بھی ہوتا ہے پیام
جاگ تو جاتی ہوں ہر روز سحر ہوتے ہی

میرے اندر سے کوئی جھوم کے نکلا باہر
تیرے اس شہر میں آنے کی خبر ہوتے ہی

میں بھی دانوں سے بھری تھالی اٹھائے نکلی
شور سے بھر گیا دالان سحر ہوتے ہی

کونپلیں کر نہ دیں انکار جواں ہونے سے
کاٹ کر پھینک نہ دے کوئی شجر ہوتے ہی

غزل

کبھی اس دل میں حسرت جھانکتی ہے
کبھی آنکھوں میں حیرت جھانکتی ہے

کبھی حُسنِ طلب ہوتا ہے دل میں
کبھی سینے میں نفرت جھانکتی ہے

نہیں ہوتی کبھی تیری ضرورت
کبھی حسبِ ضرورت جھانکتی ہے

بہ طورِ خاص اِن آنکھوں میں دیکھو
بصارت میں بصیرت جھانکتی ہے

اگر دیکھیں تو اُن کی دوستی میں
عداوت ہی عداوت جھانکتی ہے

ندیمِ خوش نوا شعروں میں تیرے
حقیقت! در حقیقت جھانکتی ہے

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

فلسطیں میں اُجالے مر رہے ہیں
غزہ میں چاند تارے مر رہے ہیں

زمینِ انبیاؑ ڈوبی لہو میں
مسلسل لوگ کتنے مر رہے ہیں

ترانوں کی تو چھوڑو بات ہی تُم
سِتم وہ ہے کہ نوحے مر رہے ہیں

نمانی فاختہ بھی جاں بہ لب ہے
فضاؤں میں پرندے مر رہے ہیں

اُدھر بارُود کی بارش ہے جاری
اِدھر معصوم بچّے مر رہے ہیں

غضب چھڑکاؤ ایسا تیل کا ہے
کہ آتش ریز شعلے مر رہے ہیں

ہوس جبر و تشدّد کی ہے مُہلک
اخوّت رنگ دعوے مر رہے ہیں

کہاں ہیں امنِ عالم کے وہ داعی؟
یہ دیکھیں، زندہ لاشے مر رہے ہیں

دُھواں بھی حسرتوں کا اُٹھ رہا ہے
نشیمن بھی بچارے مر رہے ہیں

خسارہ ہے مگر انسانیت کا
ہمارے یا تمہارے مر رہے ہیں

اجل یوں دندناتی پھر رہی ہے
کہ چارہ کرنے والے مر رہے ہیں

مظالم کس طرح فیضانؔ لکھوں
کہ مصرعے شعر جُملے مر رہے ہیں

فیض رسول فیضان

غزل

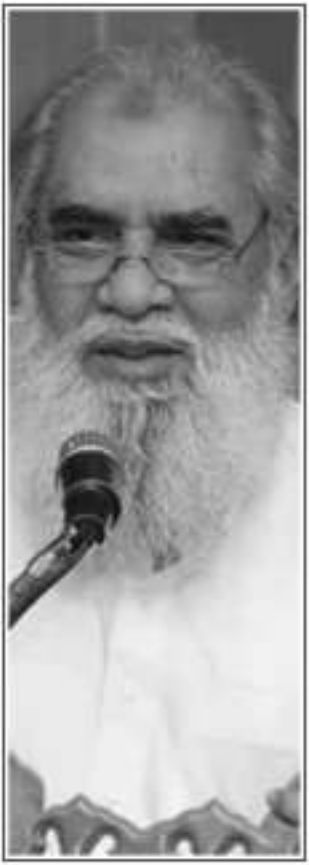

ٹھہرے تو سدا ٹھہرے ، جائے تو ابھی جائے
یا سر پہ نہیں چمکے ، یا گھر میں اتر آئے

برسے تو بہت برسے ، حسرت نہ رہے باقی
ورنہ مری کھیتی سے ، بن برسے گزر جائے

اپنا تو ہے ناممکن ملنا بھی بچھڑنا بھی
اڑتے ہوئے تم بادل ، بہتے ہوئے ہم سائے

منزل سی خوشی پائی ، رستوں سا نشہ پایا
اک عمر کی دوری سے ، جب لوٹ کے گھر آئے

گو نکلا نہیں اب تک ، اس عشق کی وادی سے
پر اتنا نہیں اب تو ، ہر سوچ میں در آئے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

غزلیں

ہمیں تُو اور نہ کر غم زدہ براہِ کرم
مزید آنکھ نہ ہو نم زدہ براہِ کرم

ظروفِ ظرف کا کچھ تو خیال کر ساقی
یہ شہد پیش نہ کر ، سَم زدہ براہِ کرم

جو میرے ہاتھ میں تعویذ ہے محبت کا
گلے میں پہن وہی دَم زدہ براہِ کرم

ترے سلوک نے چھینی ہے کج کُلاہی بھی
نہ پھر جُھکا یہ کمر خم زدہ براہِ کرم

کسی کی چشمِ طلب کو حقیر تُو نہ سمجھ
نظر نہ یُوں اُٹھا برہم زدہ براہِ کرم

اسی لیے ترے شہرِ غزال میں آئے
دِکھا غزال کوئی رم زدہ براہِ کرم

یہ آفتاب کا دِل بھی تو آستانہ ہے
دھمال ڈال ، دمادم زدہ براہِ کرم

آفتاب خان

کرو نہ کام کسی طور بھی خلافِ شرع
بدن پہ، روح پہ اوڑھے رہو، لحافِ شرع

چھپا کے خود کو، کسی حجرۂ خفی میں نہ رکھ
جہاں میں اور بہت سے ہیں اِعتکافِ شرع

جسے پسند جو مَسلک ہے، اُس پہ چھوڑ اُسے
عداوتوں کو بڑھاتا ہے اِختلافِ شرع

وہ احترام کے قابل ہے ، احترام سے مِل
سِکھا رہا ہے تجھے جو بھی شین قافِ شرع

نہ چُوم جام کے رکھ دے وہ طاقِ نسیاں پَر
چڑھا ہوا ہے جو قرآن پر غلافِ شرع

جو غور و فکر ہو، دلچسپ ہے یہ کام بہت
مگر لگے تجھے پیچیدہ کیوں زِحافِ شرع

یہ روشنی جو بکھیرے ہے آفتاب یہاں
کرو جو غور تو یہ بھی ہے اعترافِ شرع

غزل

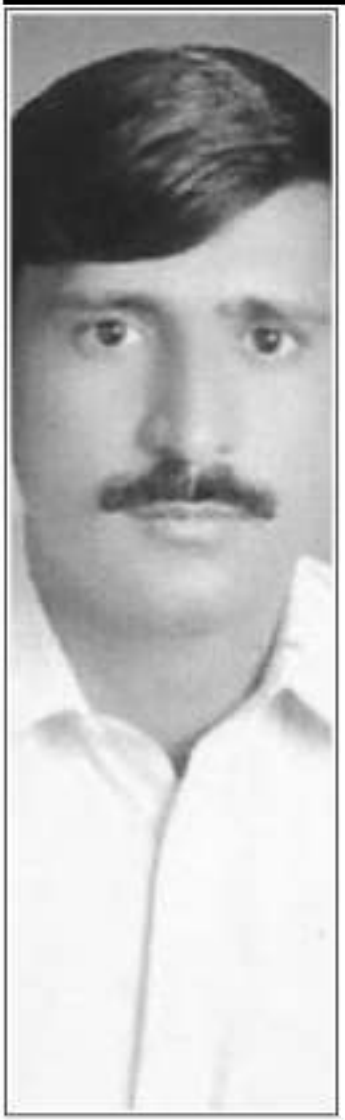

تمھاری چشمِ عنایات اور کیا ہو گی
پھر اس کے بعد ملاقات اور کیا ہو گی

متاعِ حرف و قلم تم پہ وار دی ہم نے
تمھارے واسطے سوغات اور کیا ہو گی

یہ چند اشک بھی صحرا کی نذر کر ڈالے
ہماری آنکھ سے برسات اور کیا ہو گی

وہ جیت کر بھی پشیماں ہے اپنی حالت پر
تمھی بتاؤ اسے مات اور کیا ہو گی

وہ دل کی بات بتانے سے کیوں گریزاں ہے
نہیں یہ بات تو پھر بات اور کیا ہو گی

گزر رہی ہے مری زندگی اندھیروں میں
مرے نصیب میں اب رات اور کیا ہو گی

ابھی تو عشق کا آغاز ہے میاں دانش
نہ جانے صورتِ حالات اور کیا ہو گی

اعجاز دانش

غزل

خالدہ انور

گرچہ دل اُن سے کنارا مانگے
چشمِ امکان نظارہ مانگے

چاند مانگے نہ ستارہ مانگے
طفلِ معصوم غبارہ مانگے

ہم سے جو صرف سہارا مانگے
کاش وہ دل بھی ہمارا مانگے

صحتِ عقل پہ شک ہوتا ہے
جب کوئی خود ہی خسارہ مانگے

منتِ اشک تھی جس طرح کوئی
غم کے طوفاں میں کنارا مانگے

کیا کہوں اِس سے، بتا دے مجھ کو
دل اگر ساتھ تمھارا مانگے

دل تو اظہار نہیں کرنے کا
تجھ سے ہی کوئی اشارا مانگے

آج کا لاڈلا تو کھیلن کو
چاند کے ساتھ ستارا مانگے

غزل

عُمر ڈھلنے کے بعد کیا ہو گا؟
رُت بدلنے کے بعد کیا ہو گا؟

جھوٹے وعدوں کے ریشمی پھندے
شہ!! بدلنے کے بعد کیا ہو گا؟

راکھ کا ڈھیر بن گیا ہُوں میں
اور جلنے کے بعد کیا ہو گا؟

ہم تو دورِ خزاں میں پاگل ہیں
پُھول کھلنے کے بعد کیا ہو گا؟

کیا خبر میرے سچ ترازو پر
جھوٹ تُلنے کے بعد کیا ہو گا؟

ہاتھی جیتیں گے یا پیادے اَب
چال چلنے کے بعد کیا ہو گا؟

تتلیاں، پھول میرے خواب میں تھے
آنکھ کھلنے کے بعد کیا ہو گا؟

دل کا ملنا عقیل لازم ہے
ہاتھ مِلنے کے بعد کیا ہو گا؟

عقیل رحمانی

غزلیں

یوں بھی شوکت ہوا بارہا، آدمی
خود کو خود بھولتا ہی گیا ، آدمی

بحرِ نفریں میں ڈوبا ہوا ، آدمی
کس قدر ہو گیا بے وفا ، آدمی

ایک لمحے کی تسکین کے واسطے
دربدر ہی بھٹکتا رہا ، آدمی

زندگی ، تیز سے تیز تر ہو گئی
گردشِ روز و شب میں ڈھلا ، آدمی

ہم نے اپنے تئیں ، چھان مارا جہاں
تم سا لیکن نہ کوئی ملا ، آدمی

اب محبت کی رسمیں فسانہ ہوئیں
اب کہاں ہے وہ ''فرہاد'' سا ، آدمی

آج بھی ہم کو بے چین شوکت ، رکھے
دل کے اندر کہیں پر چھپا ، آدمی

شوکت محمود شوکت

زندگی سے اس لیے اکتا گئے
نخلِ جاں کو غم کے دیمک کھا گئے

اک ذرا ٹوٹا جو بندھن ضبط کا
سب کے سب شکوے زباں پر آ گئے

ہو گئی ، ظاہر محبت ہو گئی
نام میرا جب لیا ، شرما گئے

لوگ گندم گوں نہیں اب کے رہے
عرصہ بیتا ، میر جی فرما گئے

اوج پر گلشن میں ہے جورِ خزاں
پھول کیا ، غنچے بھی سب مرجھا گئے

جب تمھاری ذات میں ہم گم ہوئے
بالیقیں ، ہم رازِ ہستی پا گئے

ہم جنوں پیشہ تھے شوکت ، اس لیے
دشت ، شہروں سے زیادہ بھا گئے

غزل

خوشحال ہوئے ہیں کب گلنار زمینوں سے
پھل پھول ملے ہم کو پرخار زمینوں سے

کردار کی طاقت سے تعمیر اُٹھائی جب
خود پھوٹ پڑے روشن افکار زمینوں سے

کب موت انہیں آئی ہر عہد کے لوگوں میں
آتے ہیں نکل کر جو فنکار زمینوں سے

ناشاد رہے ہیں وہ بدبخت زمانے میں
کھلواڑ جو کرتے ہیں ہموار زمینوں سے

بارود کی فصلوں سے کھلیان ہوئے برباد
جب کاٹ لیے خود ہی اشجار زمینوں سے

بیکار پڑے ہوں جب تقسیم کے جھگڑوں میں
پھر بھوک ہی اگتی ہے چھتنار زمینوں سے

خاموش سکندر ہیں قانون وراثت کے
محروم کھڑے ہیں اب حقدار زمینوں سے

مرزا سکندر بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں دل میں خنجرِ حالات گھونپ کر
مظلوم تھے مگر بڑے سفّاک ہو گئے

غزل

وہ بے حسی ہے عقل بھی حیراں ہے آجکل
سہتا ہوا جو ظلم مسلماں ہے آج کل

اللہ بھیج دیجے کمک آسمان سے
اجڑا ہوا ''غزہ'' کا گلستاں ہے آج کل

تاریکیوں میں ڈوبی فلسطیں کی سرزمین
دشمن کی چال خوب فروزاں ہے آج کل

اپنی پڑی ہے سب کو، نہیں فکر دین کی
اس دور کا یہ کیسا مسلماں ہے آج کل

امن و امان جیسے کہ دنیا سے اٹھ گیا
''جس کو بھی دیکھو وہ ہی پریشاں ہے آج کل''

دہشت زدہ ہے آج فلسطیں کی سرزمین
ایمان و کفر دست و گریباں ہے آج کل

یہ کفر مٹ ہی جائے گا اک روز دیکھنا
طاقت پہ اپنی کتنا وہ نازاں ہے آج کل

ناصح کی سب نصیحتیں افروز کیا ہوئیں؟
سچ بولنے سے وہ بھی گریزاں ہے آج کل

افروز رضوی

غزل

بس اس لئے شفاف ہے کردار ہمارا
کہ دوست نہیں کوئی بھی زردار ہمارا

ہم قصۂ دلگیر بھلا کس کو سنائیں
کوئی بھی نہیں محرمِ اسرار ہمارا

ہم کیسے کریں جاناں ترے حسن کی مدحت
موضوع نہیں ہے لب و رخسار ہمارا

بے خوف تو کر ہم پہ ستم اور تشدد
کوئی بھی نہیں یار و مددگار ہمارا

کیا ہم پہ گزرتی ہے سمجھ سکتے نہیں تم
بس رب کو پتہ ہے غم و آزار ہمارا

سب ایک تری ذاتِ حسیں پر ہے نچھاور
جتنا بھی ہے سرمایۂ افکار ہمارا

تھا بھوک میں وہ وزن کہ اس کے "ذکی" نیچے
دب کر کے فنا ہو گیا پندار ہمارا

ذکی طارق

غزلیں

یہ پڑے ہیں جبہ و دستار میں جلدی میں ہوں
مجھ کو جانا ہے فلک کے پار میں جلدی میں ہوں

اس جنم میں بھی محبت کی نہیں مہلت ملی
پہلے تو جلدی میں تھا، اس بار میں جلدی میں ہوں

کچھ بھی کر، جیسے بھی ہو، بس وقت سے آگے نکل
جتنی ممکن ہو بڑھا رفتار میں جلدی میں ہوں

مجھ پہ طاری ہو رہا ہے دیر ہو جانے کا خوف
راستہ دیتی نہیں دیوار میں جلدی میں ہوں

جنگ لڑنی ہے مجھے اپنی محبت کے لئے
چاہیے ہے اب مجھے تلوار میں جلدی میں ہوں

رانا سعید دوشی

پانیوں سے بجھا گیا ہے مجھے
صبر کرنا سکھا گیا ہے مجھے

پھر بھی کیوں جی نہیں رہا ہوں میں
اب تو جینا بھی آ گیا ہے مجھے

لوٹ کر کیا کبھی نہ آئے گا؟
وہ جو پتھر بنا گیا ہے مجھے

جس طرح کھا گئی ہے تجھ کو زمین
یوں ترا ہجر کھا گیا ہے مجھے

جی رہا ہوں یہاں میں تیرے بغیر
یہ بھی طعنہ دیا گیا ہے مجھے

اب ترے پاس آ رہا ہوں میں
بے مروت کہا گیا ہے مجھے

غزل

کیا عجب جو ہے مجھ میں، نُور سب تمھارا ہو
جیسے میں ہُوں سیارا تم مرا ستارا ہو

شعر میں نہیں کھُلتا ، آنکھ سے نہیں بہتا
دُکھ بہت ہی گہرا ہے کیسے آشکارا ہو

نارسا محبت کے ناروا رویوں سے
پھر سے ٹُوٹ جاؤں میں دل اگر دوبارا ہو

آگہی کی قیمت ہے بے خودی غنیمت ہے
سُود ہو زیاں جیسے منفعت خسارا ہو

سانس اب تو بس میں ہے یار ہر نفس میں ہے
وصل دسترس میں ہے ہجر کیوں گوارا ہو

آنکھ وہ جو روئے بھی خواب وہ جو ٹُوٹے بھی
دل کو دل نہیں کہتے جب تلک نہ ہارا ہو

رتجگوں کے دھارے میں دل رہا خسارے میں
نیند ہو تو پُوری ہو خواب ہو تو سارا ہو

وقت کی گرانی میں ، عہدِ رائگانی میں
میں تمھارا ساگر ہوں تم مرا کنارا ہو

محمد سلیم ساگر

غزل

خود غرض دور میں رہنا دلِ سادہ رکھنا
اپنی اوقات سے کچھ بھی نہ زیادہ رکھنا

اپنے دامن سے لپٹتی ہوئی مٹی کی قسم
بڑا مشکل ہے یہاں صاف لبادہ رکھنا

اُنگلیاں لاکھ اُٹھائیں گے زمانے والے
تم مگر پیشِ نظر خیر زیادہ رکھنا

بات کرتے ہوئے ہونٹوں سے لہو ٹپکے گا
پھر بھی سچ کہنے کا اے دوست! اِرادہ رکھنا

وقت ہر چیز میں ترمیم کیے جاتا ہے
خود کو اِک حال میں اِتنا نہ زیادہ رکھنا

زندگی بھر تو میسر نہ ہوا ہم کو لباس
ننگے جسموں کے لیے خاک لبادہ رکھنا

یہ الگ بات کہ اظہار نہ ہونے پائے
ایسا کرنے کا بہرحال اِرادہ رکھنا

عاجزی میں جو بلندی ہے بلندی ہی رہے
میرے مولا! تُو مجھے خاک نہادہ رکھنا

ایسا کر سکتی ہے اب خلعتِ شاہانہ بھی
شرطِ رُسوائی نہیں چاک لبادہ رکھنا

نظر آئے گی یہاں وسعتِ عالم تم کو
گھر کا آنگن نہ سہی دل تو کشادہ رکھنا

میں کسی اور ہی نشّے میں رہا کرتا ہوں
میرے آگے نہ کبھی ساغر و بادہ رکھنا

اِک طرف دھیان میں رکھنا کوئی طوفانِ بلا
اِک طرف پائے خجالت سرِ جادہ رکھنا

آسماں رشک کرے جس کی بلندی پہ نبیل
قد و قامت کو کچھ اس طور ستارہ رکھنا

نبیل احمد نبیل

غزل

قدم پیری کی جانب اس قدر بڑھنے لگے ہیں
ہجومِ آرزو سے رابطے گھٹنے لگے ہیں

مجھے تو خود نہیں دعویٰ کوئی قدآوری کا
اُٹھا کر ایڑیاں کچھ لوگ کیوں چلنے لگے ہیں

ہے منزل وادیٔ کُن کی حدود سے بھی کہیں دُور
اور اک ہم ہیں وجودِ خاک سے اُگنے لگے ہیں

مراسم بن گئے ہیں جب سے اپنے بے بسی سے
بڑی آسودگی سے رات بھر سونے لگے ہیں

بس اک دن آنکھ بھر کر مجھ کو دیکھا تھا کسی نے
امیدوں کے دیے چاروں طرف جلنے لگے ہیں

مداروں میں یہ کیسی کھلبلی سی مچ گئی ہے
کہ تارے آسماں سے ٹوٹ کر گرنے لگے ہیں

ترقی کے ثمر کیسے ہوئے تقسیم فرحان
کہ مزدوروں کے بچے بھوک سے مرنے لگے ہیں

سرور فرحان

غزل

اک پیار کی کیا جلی ہے مشعل
ہر ایک نظر میں ہوں مسلسل

بستی ہے لہو لہو مری تو
گھر بھی تو، خدا ترا ہے مقتل

واقف ہے ترے حسن سے ہر اک
چلمن میں چھپے کہ تانے آنچل

حق بات پہ مر مٹے جو واعظ
یہ عشق کوئی نہیں ہے پاگل

سن ہوک مری غزل کی محسن
اُس آنکھ سے بہہ گیا ہے کاجل

میتھیو محسن

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

آج خالد ہمیں کاش جینے ہی دیں
چوکھٹوں میں جو کل ہم کو جڑ جائیں گے

غزل

ان کو میرے ساتھ ہی جلنا پڑا
بارشوں کو میں بہت مہنگا پڑا

تھا سفر میرا خود اپنے آپ میں
اس سفر میں بھی مجھے دریا پڑا

اس کی محفل میں ہوئے بے آبرو
اور دعا دے کے ہمیں اٹھنا پڑا

یوں لگا جیسے کسی نے دی صدا
ہر قدم پر ہی مجھے رکنا پڑا

میں کسی کی آنکھ سے سر سبز تھا
میں کسی کی بات سے پیلا پڑا

جسم پر میرے دراڑیں پڑ گئیں
غصہ مجھ کو روز ہی پینا پڑا

جسم شوکت اس کا اتنا پاک تھا
اپنے اشکوں سے اسے دھونا پڑا

افتخار شوکت

غزل

مجھے وقتی سہارا بھی یہاں کوئی نہیں دیتا
مسافر ہوں، مسافر کو مکاں کوئی نہیں دیتا

زمیں تو ایک دوجے کو زمانہ دے ہی دیتا ہے
مگر اک دوسرے کو آسماں کوئی نہیں دیتا

سبھی اُس کے حواری ہیں سبھی اُس کے پجاری ہیں
خداوندا مرے حق میں بیاں کوئی نہیں دیتا

اُدھاری چیز دے دیتے ہیں گاہک کو دکاں والے
ارے نادان، گاہک کو دکاں کوئی نہیں دیتا

یہ صبر و استقامت ہے علی کے لال کا ورنہ
خدا کی راہ میں بیٹا جواں کوئی نہیں دیتا

ضروری بات بھی انصر کسی سے کر نہیں سکتے
ہماری بے زبانی کو زباں کوئی نہیں دیتا

انصر حسن

غزل

فراق و ہجر کے ماروں نے اڑ ہی جانا تھا
وطن کی سمت پرندوں نے اڑ ہی جانا تھا

افق سے کوندتی کرنوں کی نیزہ بازی سے
سحر کے شبنمی قطروں نے اڑ ہی جانا تھا

گلوں کی کلیوں کی بازار میں ضرورت تھی
چمن سے تتلیوں بھنوروں نے اڑ ہی جانا تھا

یہاں تو غربت و افلاس ہی پنپتی ہے
دیارِ غیر کو یاروں نے اڑ ہی جانا تھا

عجب اب کے تھا طوفانی بارشوں کا سماں
تمھارے پیار کے رنگوں نے اڑ ہی جانا تھا

اسی لیے تو رضا بلبلیں تھیں نوحہ کناں
گلاب رنگ بہاروں نے اڑ ہی جانا تھا

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرِ حیات اک الزام دھر گئے ہم بھی
کلام بھی جیا اور مر گئے ہم بھی

غزل

میں تجھے ڈھونڈنے نکل پڑا تھا
تو مرے پاس ہی کہیں کھڑا تھا

میں نے رختِ سفر تھا باندھ لیا
پہلا پتا شجر سے جب جھڑا تھا

پھیر لی تھیں ہر ایک نے نظریں
اک ذرا وقت مجھ پہ آ پڑا تھا

جب خدا تھے سبھی خلاف مرے
میرے سب دشمنوں سے تو لڑا تھا

پار تو نے مجھے لگایا تھا
جب مری ناؤ ، ریت کا گھڑا تھا

تو نے ایمان کی حفاظت کی
امتحاں ایک بس یہی کڑا تھا

میں سمجھتا تھا کچھ بڑوں کو بڑا
تو تو ہر اک بڑے سے بھی بڑا تھا

اس کو کیسے اکھاڑتی دنیا
جو علم تیرے ہاتھ سے گڑا تھا

مجھ کو تھا تیرا آسرا مولا
جب بھی میں اپنی بات پر اڑا تھا

میں اکیلا تھا پر اکیلا نہ تھا
ذات واحد تری مرا دھڑا تھا

ہو کے مایوس اہل عالم سے
میں ترے پاس آکے رو پڑا تھا

میں تو پتھر تھا ، صرف اک پتھر
تو نے دستار میں مجھے جڑا تھا

علمدار حسین

غزلیں

نگاہ برق دل کو آفتاب کر
تُو اب مِرا دماغ مت خراب کر

یہ کائنات راز ہے تو راز کھول
وگرنہ بند اپنا یہ خطاب کر

گمان سے یقین کے سفر پہ چل
کبھی تو خود کو بھی شکست یاب کر

بہشت اک خیال ہے، سوال ہے
تُو زخم زخم زندگی گلاب کر

گناہ اور ثواب کے بغیر بھی
جو نیک کام ہوں وہ بے ثواب کر

اگر میں لاپتہ ہوں تو پتہ لگا
اگر کہیں نہیں تو بازیاب کر

تُو روز اک نئی غزل ضرور لکھ
مگر غزل سے شعر انتخاب کر

سحر تاب رومانی

دامنِ گرد میں سمٹ کر میں
رو پڑا دشت سے لپٹ کر میں

زندگی داد دے مجھے اِس پر
جی رہا ہوں گھسٹ گھسٹ کر میں

دیکھنا ہو تو دیکھتا ہوں پھر
عکس کو آئنے سے ہٹ کر میں

اُس کی خوشبو کشید کرتا ہوں
اکثر اُس سے لپٹ لپٹ کر میں

کینوس پر نگاہ ڈالوں گا
روشنائی ذرا اُلٹ کر میں

میری بوسیدگی میں ندرت ہے
اور نیا ہو رہا ہوں پھٹ کر میں

دیکھ کر اُس کو بھول جاتا تھا
ورنہ آتا سبق تھا رٹ کر میں

جب میسر نہیں تھا پانی بھی
پی رہا تھا شراب ڈٹ کر میں

اُس کی محفل میں ایک بار گیا
پھر نہ آیا سحر پلٹ کر میں

غزل

غبارِ دشت میں رستہ دکھائی دینے لگا
بھٹک گیا تو ستارہ دکھائی دینے لگا

بہت قریب سے دریا نظر نہیں آیا
بہت ہی دور سے چشمہ دکھائی دینے لگا

اسے میں اتنی بلندی سے جاتے دیکھتا ہوں
افق کے پار بھی جلوہ دکھائی دینے لگا

بتا رہا تھا وہ دریا کے بارے اور اس میں
مجھے بھنور کا اشارہ دکھائی دینے لگا

ڈرا رہے تھے سبھی لوگ جب بلندی سے
مجھے پہاڑ پہ زینہ دکھائی دینے لگا

سمجھ رہا تھا جسے میں ہمالیہ جیسا
قریب آیا تو ٹیلہ دکھائی دینے لگا

درود پڑھتے ہوئے مانگی جب دعا شاہد
ہتھیلیوں میں مدینہ دکھائی دینے لگا

شاہد اشرف

غزل

اک روز لگی ان کو بری بات ہماری
تب سے ہے بری صورتِ حالات ہماری

بے کار ہوئی جاتی ہے اب ذات ہماری
کرتا ہی نہیں کوئی یہاں بات ہماری

دُکھ، درد، اُداسی، ترا غم، رنج، کسک، یاد
اب کیفیتیں بس ہیں یہی سات ہماری

ہم جان گئے، اور وضاحت نہیں بنتی
کتنی ہے ترے سامنے اوقات ہماری

جس جگہ نہیں تھا کوئی اُگنے کا تصور
ایک ایسی زمیں پر ہوئی برسات ہماری

آتے ہی نہیں خواب کسی طور بھی ہم کو
ایسے ہی گزر جاتی ہے اب رات ہماری

اے دوست! ہرا دو ہمیں لیکن یہ رہے یاد
تم سہہ نہیں پاؤ گے کبھی مات ہماری

جس چیز کے باطن میں تری یاد ہو شامل
مہنگی نظر آتی ہے وہ سوغات ہماری

دنیا سے بہت چھپ کے تمھیں دیکھنے آنا
تم کیسے بھلاؤ گے مہمات ہماری؟

یہ زلزلہ و برق نہیں، عشق ہے صاحب
بالکل ہیں الگ قدرتی آفات ہماری

رخسانہ سمن

غزل

وہ ساتھ تھا پہ مجھ پہ وہ اکثر نہیں کھلا
اُس دوزخے کا آنکھ پہ منظر نہیں کھلا

گاہے وہ کر رہا تھا تجلّی سے سرفراز
لیکن وہ مجھ پہ آنکھ برابر نہیں کھلا

اچھا ہوا کہ شام بھی اچھے سے کٹ گئی
اچھا ہوا کہ یاد کا دفتر نہیں کھلا

آنچل ہوائے شام کا جلنے سے بچ گیا
جلتا دیا جو شام کے سر پر نہیں کھلا

اچھا ہوا کہ ہم سرِ چلمن ٹھہر گئے
اچھا ہوا کہ وہ مہِ انور نہیں کھلا

اس بار بھی دیے کو جلایا ہے طاق میں
اس بار بھی دیے کا مقدر نہیں کھلا

کہنے کو ایک عمر رفاقت رہی مگر
شاہد تمہارا ساتھ ہی ہم پر نہیں کھلا

افتخار شاہد

غزلیں

اِک دلربا جو میری کہانی میں آ گیا
رنگِ شباب ڈھلتی جوانی میں آ گیا

ابرِ کرم وفاؤں کا برسا جو ٹوٹ کر
دریا محبّتوں کا روانی میں آ گیا

موسم جو دل کا راس نہ آیا تو ایک دن
وہ شخص میری آنکھ کے پانی میں آ گیا

اَب مُڑ کے دیکھنا بھی گوارا نہیں اُسے
ایسا غرور یوسفِ ثانی میں آ گیا

سمجھو کہ عمر گھٹ گئی ہے سارے تھان کی
کمزور دھاگا جب کسی تانی میں آ گیا

دامن میں اُس کے بھر دیا میں نے سحرؔ کا نور
سائل جو دل کی راج دھانی میں آ گیا

اکرم سحر فارانی

خامشی میں گُفتگو کا ضابطہ بنتا گیا
مُلتجی آنکھوں کا پانی اِلتجا بنتا گیا

بات کا آغاز کرنا تھا سو ہم نے کر دیا
بات سے پھر بات نکلی سلسلہ بنتا گیا

حرف نامِ گُل بدن کے بن گئے حرفِ ردی
اور اُس کی خوشبُوؤں سے قافیہ بنتا گیا

عشق والوں کی جبیں سائی کا یہ اعجاز ہے
رفتہ رفتہ حُسن ہی اُن کا خدا بنتا گیا

عزم کے آگے نہ ٹھہرا راہ کا پتھر کوئی
بند رستہ جب ہوا کوئی نیا بنتا گیا

جھیل میں پتھر گرا تو خامشی برہم ہوئی
یُوں ہوا پھر دائرے پر دائرہ بنتا گیا

میرے پیچھے آنے والوں کو سہولت ہوگئی
آبلوں کا مسکرانا رہنما بنتا گیا

رات روشن ہوگئی میری سحرؔ کے نور سے
اشک جو پلکوں پہ آیا قُمقمہ بنتا گیا

غزل

وہ حوصلے کو مرے جونہی آزمائے گا
جنون شوق سے تاروں کو توڑ لائے گا

مرا خیال اندھیروں کو روکنے کے لیے
ترا خیال خود پھر روشنی بنائے گا

ہرایک سوچ پہ تیری لکھا ہوا ہوں میں
کہاں کہاں سے مرے نقش کو مٹائے گا

میں انتظار کروں گا یقین ہے اس کو
مجھے گماں ہے کہ وہ لوٹ کر نہ آئے گا

ذرا سا اس سے محبت میں فاصلہ رکھو
بچھڑ گیا تو وہ شدت سے یاد آئے گا

پلٹ کے پھر سے میں آجاؤں عین ممکن ہے
مگر یہ وقت دوبارہ کبھی نہ آئے گا

میں جس یقین کے رستے پہ چل رہا ہوں کمال
وہ آنکھ بن کے مجھے روشنی دکھائے گا

محمد اشرف کمال

غزل

درس دیتے رہے محبت کا
لفظ سیکھا نہ ہم نے نفرت کا

اپنے آجر سے حق میں چھینوں گا
اپنا جھگڑا ہے اس سے اجرت کا

اس کی آنکھوں میں اشک ہوتے ہیں
ذکر ہوتا ہے جب محبت کا

دیکھ ہر پیار کی کہانی میں
ذکر آئے گا ایک عورت کا

اس پہ تعزیر تو لگے گی اب
جس پہ الزام ہے بغاوت کا

اور تجھ سے نہیں تعلق اب
ایک رشتہ بچا مروت کا

منصفِ وقت سے ذرا پوچھو
فرض بنتا ہے کیا حکومت کا

خواب کیسے خرید پاؤ گے
وہ تقاضا کرے گا قیمت کا

مجھ خطاکار کو ملے گی کیا؟
رب نے وعدہ کیا ہے جنت کا

اُس کی نسلیں غلام رہتی ہیں
جس نے سودا کیا ہو عزت کا

جس کو چاہا نہ مل سکا عابد
کھیل سارا ہے یار قسمت کا

عابد معروف مغل

غزل

بشر آغاز میں ناشاد نہیں ہوتے تھے
جیسے ہم ہیں کبھی اجداد نہیں ہوتے تھے

علم ترغیبِ مفادات نہیں ہوتا تھا
فلسفے جھوٹ کی بنیاد نہیں ہوتے تھے

سیکھنے اور سکھانے کے الگ تھے معیار
سارے شاگرد ہی استاد نہیں ہوتے تھے

زندگی برسرِ پیکار نہ تھی زندگی سے
شہر اشجار پہ آباد نہیں ہوتے تھے

یونہی پہناتے پھریں طوقِ غلامی سب کو
آدمی اتنے بھی آزاد نہیں ہوتے تھے

اپنی مٹی سے تغافل پہ رضامند کبھی
چاند کی دھن میں زمیں زاد نہیں ہوتے تھے

کوئی اندازِ نظر ہوتا تھا انسانوں کا
صرف مجموعہء اضداد نہیں ہوتے تھے

علم کردار سے اظہار کیا کرتا تھا
لوگ جب حاملِ اسناد نہیں ہوتے تھے

روز مشرق سے نئی آس ابھر آتی تھی
درد پر درد ہی ایزاد نہیں ہوتے تھے

ذہن نشیں ہوگئی اک چاندسی صورت جاذب
جب پہاڑے بھی مجھے یاد نہیں ہوتے تھے

اکرم جاذب

غزل

ہر گھڑی وحشت کے عالم میں ندا ہوتی نہیں
سچ تو یہ ہے مجھ سے اب کوئی دعا ہوتی نہیں

اس نمازِ عشق کا کیسا نرالا بھید ہے
کچھ ادا کرتے نہیں کچھ سے قضا ہوتی نہیں

زندگی کے راستوں پر چل نہیں سکتا تھا میں
ساقیا مجھ پر اگر تیری عطا ہوتی نہیں

سوچ کر چلنا کہ راہِ جذب و مستی ہے الگ
اس سفر کی زندگی بھر انتہا ہوتی نہیں

اپنی اپنی سوچ ہے ورنہ زمانے میں رضا
کوئی بھی شئے درحقیقت بدنما ہوتی نہیں

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزل

گو اب مرے وجود پہ سر ہے نہ دوش ہے
پھر بھی وہی جنوں وہی جوش و خروش ہے

تجھ سا کوئی نہیں ہے وگرنہ جہان میں
کوئی ذہین ہے تو کوئی سخت کوش ہے

تُو نے رکھا نہ حلقہء احباب میں جسے
وہ شخص آج بھی ترا حلقہ بگوش ہے

رن میں ہمیں رجز کی ضرورت نہیں کہ اب
اتنا بدن میں خون نہیں جتنا جوش ہے

ادراک سے فزوں ہے مری حالتِ جنوں
تُو جانتا نہیں کہ تجھے عقل و ہوش ہے

انسان کے مزاج میں یکسانیت نہیں
میں کیسے مان جاوں کہ بندہ، سروش ہے

اتنا غرور قصرِ شہی پہ نہ کیجیے
یاں کوئی مستقل نہیں خانہ بدوش ہے

بس میں ہی چپ نہیں ہوں سرِ بوستانِ عشق
بلبل بھی گل کے ساتھ برابر خموش ہے

یہ کون پڑھ رہا ہے مراثی انیس کے
ہر سمت مرحبا کی صدا زیبِ گوش ہے

وہ آنکھ آنکھ ہے کہ جو رکھتی ہے معرفت
وہ گوش گوش ہے جو حقیقت نیوش ہے

میں جو ہوا ہوں قریہ بہ قریہ ذلیل و خوار
اِس میں بھی تیرے طرزِ تغافل کا دوش ہے

واعظ برا نہ کہہ مری بزمِ نشاط کو
یاں پر تری بہشت سے کم ناونوش ہے

جس کا بھی سر بعید ہے نیزے کی نوک سے
میرا نہیں خیال کہ وہ سر فروش ہے

اتنی شفق نما ہے رُخِ یار کی پھبن
جتنی چراغِ شام کی لو سُرخ پوش ہے

ازور شیرازی

غزلیں

بے بسی سی بے بسی ہے
زندگانی رو پڑی ہے

کاش تم بھی جان پاتے
خواب سے ہی زندگی ہے

کھو گیا جانے کہاں وہ
آشنا سا اجنبی ہے

دل میں ہے کیسی اداسی
کچھ تو ہے جس کی کمی ہے

آ گیا ہے مجھ کو جینا
سوچ میری منطقی ہے

نائلہ راٹھور

لڑکھڑاتی ہے طبیعت تو عصا مانگتی ہے
میری تنہائی بھی قربت کا نشہ مانگتی ہے

ان دھواں دیتی مشینوں سے تنگ آئی خلقت
سانس لینے کے لیے تازہ ہوا مانگتی ہے

جن کے ہاتھوں سے گنوا بیٹھی ہے قدریں اُمت
ان خداؤں سے رعایت کی دعا مانگتی ہے

اجنبیت کا کیے رکھا ہے پردہ برسوں
ورنہ دنیا تو مرے گھر کا پتہ مانگتی ہے

تم مجھے چاہو سمجھنا تو سمجھ سکتے ہو
ایک آواز ہوں جو اپنی صدا مانگتی ہے

دستِ قدرت کو روا ہے کہ دُعا رد کر دے
میری حاجت بھی عجب ہے کہ خدا مانگتی ہے

جس سے آنچل کو نہ خطرہ ہو ڈھلک جانے کا
ایسی ہموار ہوا اب کے ردا مانگتی ہے

ردا حاصل خلوص

غزل

یہ زخمی دل ، ستانے لگ گیا ہے
ہنر جینے کا ، آنے لگ گیا ہے

گھڑی پل کو رکو تم اے! بہارو
کوئی کانٹے بچھانے لگ گیا ہے

کوئی تو ہنس رہا ہے آج لیکن
کوئی آنسو بہانے لگ گیا ہے

شجر جو آندھیوں سے ڈر گیا تھا
وہ پاؤں پھر جمانے لگ گیا ہے

زمانہ چین سے رہنے نہ دے گا
مجھے پھر سے رلانے لگ گیا ہے

ترے آنے سے نکھرا آج موسم
یہ آنگن چہچہانے لگ گیا ہے

قدم رکھے چمن میں جب سے گل نے
نشہ گل پر بھی چھانے لگ گیا ہے

کوکی گل

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

دستِ ہوا سے پرتوِ ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صد چاک ہو گئے

غزل

کون کہتا ہے کہ میں تجھ کو جدائی دوں گی
تو جو مانگے تو تجھے ساری خدائی دوں گی

تھوڑا روئی ہوں تو دل ہو گیا ہلکا میرا
خود میں گونجی ہوں ابھی تجھ کو سنائی دوں گی

دل تلک آ ہی گیا ہے تو اسے اپنا سمجھ
اب تو میں روح تلک تجھ کو رسائی دوں گی

دل مرا گھٹنے لگا ہے تری خاموشی سے
تو صدا دے تو تجھے دستِ حنائی دوں گی

وہم ہے تیرا کہ تو مجھ کو بھلا سکتا ہے
تو جدھر دیکھ تجھے میں ہی دکھائی دوں گی

میرا دنیا میں فرح کوئی نہیں تیرے سوا
تو ہی دکھ دے گا تو میں کس کو دہائی دوں گی

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

تری بے رُخی سے بکھر گئیں، مری مہرباں سی محبتیں
تری بے وفائی سے مر گئیں، مری خوش گماں سی محبتیں

ترے ہجر کی یہ دُکھی گھڑی، مری زندگی میں ہے کیوں کھڑی؟
ترے وصل کو ہیں ٹھہر گئیں، مری بے نشاں سی محبتیں

مجھے مل سکا نہ کہیں سکوں، ابھی ہے ادھورا مرا جنوں
کسی دل میں ڈھونڈنے گھر گئیں، مری ناتواں سی محبتیں

مری زندگی کا ملال ہے، مرا تجھ سے اب یہ سوال ہے
ترے دل میں جا کے کدھر گئیں، مری آسماں سی محبتیں

مری زندگی کا غرور تھیں، مرے دل کا بھی جو سرور تھیں
مرے راستے سے گزر گئیں، مری رازداں سی محبتیں

وہ جنون خیز ملاپ تھا، ترا نام ہی مرا جاپ تھا
ترے دل سے پھر بھی اتر گئیں، مری بے زباں سی محبتیں

میں ہی تیری آنکھوں کا خواب ہوں، میں ہی تیرا جاؤ شہاب ہوں
ترے دل میں جا کے سنور گئیں، مری مہرباں سی محبتیں

شہاب اللہ شہاب

غزل

خود کو جب تولنا پڑا مجھ کو
توڑ کر بیچنا پڑا مجھ کو

میرے پُرکھوں پہ بات آ گئی تھی
بات کو کھولنا پڑا مجھ کو

ڈوب جانا تھا اُس نے ساتھ مرے
ہاتھ وہ چھوڑنا پڑا مجھ کو

اُس کی باتوں کا سحر توڑنا تھا
اس لیے بولنا پڑا مجھ کو

لوگ پتھر سمجھ رہے تھے مجھے
اس لیے ٹوٹنا پڑا مجھ کو

سب کو میں منفرد دکھائی دوں
منفرد دیکھنا پڑا مجھ کو

میرا اکمل مرے مقابل تھا
جیت کر ہارنا پڑا مجھ کو

اکمل حنیف

غزل

مجھ میں تو اتر آئی ہے تاثیر تمھاری
سینے سے لگا رکھی تھی تصویر تمھاری

خدشوں کی یہ دیمک ہی اسے چاٹ گئی ہے
تھی دل کی زمینوں پہ جو تعمیر تمھاری

ہیں درج یہاں عشق بھلانے کے وظائف
خوش خط سے تو لگتی ہے یہ تحریر تمھاری

پھر تم کو سمجھ آئے گا پنکھے سے لٹکنا
گر چھین لے تم سے کوئی تعبیر تمھاری

میں تم سے بہت دور نکل آیا ہوں لیکن
پاؤں میں ابھی تک ہے یہ زنجیر تمھاری

تم چھوڑ دو مجھ کو مری نظروں سے گرانا
تحقیر تو میری بھی ہے تحقیر تمھاری

جب وقتِ مصیبت میں ہی تم بھاگ گئے تھے
اب اس کا ازالہ نہیں تقریر تمھاری

انصر منیر

غزلیں

وہ آندھیاں چلیں، نقشِ پا نہیں رہا
یادوں کی ٹہنیوں پہ پتا نہیں رہا

نظریں چرائے بن وہ گزرا ہے پاس سے
وہ' صاف صاف کہہ دوں' میرا نہیں رہا

جب سے ملے ہیں ہم کو کچھ رابطوں کے ایپ
بزمِ جہاں میں کوئی تنہا نہیں رہا

بس ایک ثانیے میں آگے نکل گیا
میری طرح وہ تھک کر بیٹھا نہیں رہا

کل شام وہ ملا تھا کچھ احترام سے
شاید اسے لگا میں اس کا نہیں رہا

جس کے لیے چمن کو ہم چھوڑ آئے تھے
افسوس ! آج وہ بھی اپنا نہیں رہا

جب آگہی ملی تو پیارے حبیب کو
پیارا وہ زندگی سے، پیارا نہیں رہا

بشیر احمد حبیب

کسی خیال سے بندھے ہوئے تھے ہم
سمجھیو مت، یونہی رکے ہوئے تھے ہم

پلک جھپکنے تک تماشا گاہ میں
کسی کے دھیان سے اٹے ہوئے تھے ہم

خرید لائے تھے جو آگ کے عوض
اُنھی اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے ہم

زمین اک مدار کے سفر میں تھی
سفر نہیں تھا، بس رکے ہوئے تھے ہم

کنارِ شام مل رہے تھے دونوں وقت
اِدھر اُسی طرح ملے ہوئے تھے ہم

کہیں فرشتے سجدہ ریز تھے حبیب
کہیں نظر سے بھی گرے ہوئے تھے ہم

غزل

آج ٹریفک جام نہیں ہے ، اچھا ہے
مجھ کو بھی کوئی کام نہیں ہے ، اچھا ہے

میں نے کہا آرام کرو تو غُصّہ کیا
اب اُس کو آرام نہیں ہے ، اچھا ہے

میرے فارغ رہنے پر جو ہنستا تھا
اُس کے پاس بھی کام نہیں ہے، اچھا ہے

مجھ کو طعنے دیتا ہے گُمنامی کے
جس کا اپنا نام نہیں ہے ، اچھا ہے

خاص طرح کے لوگ پسند ہیں اُس کو بھی
میرا ذوق بھی عام نہیں ہے ، اچھا ہے

ورنہ یہ بھی بِک جاتی بازاروں میں
چاہت کا کوئی دام نہیں ہے ، اچھا ہے

کیفی تیرا دِین محبت ہے ، اِس میں
مُلّا کا کوئی کام نہیں ہے ، اچھا ہے

محمود کیفی

غزل

خُوب رو خُوب دندناتا ہے
خُوب رویوں سے اُس کا ناتا ہے

پھل وہ اپنے کئے کا پاتا ہے
بیج جو بھی کوئی لگاتا ہے

جو بھی آتا ہے آج دنیا میں
کل کو دیکھو تو لوٹ جاتا ہے

نیند کے ٹھیکرے پہ خوابوں کا
بھوکا پیاسا پرندہ آتا ہے

سب نے اُٹھنا ہے ایک دن آخر
کون جیتا ہے کون مرتا ہے

باغ میں چڑیا چہچہانے لگی
کوئی گلفام گھر سے نکلا ہے

اُس کی زلفوں کا ناگ بَل کھا کر
اُس کے عارضؔ پہ پہرہ دیتا ہے

سرفراز عارض

غزل

وقت ناساز اور بے مہرا
تیری فرقت کا رنگ ہے گہرا

تیرگی دیکھ کر مرے گھر کی
چاند آنگن میں رات بھر ٹھہرا

حبس اندر کا بڑھتا جاتا ہے
اپنے آنچل کو تو ذرا لہرا

ہر خوشی پھوٹتی ہے لفظوں سے
اس غزل کا ہے کس کے سر سہرا

وقت کے فیصلے نہ بدلیں گے
وقت دیتا ہے بات کا پہرا

پھول خوشبو نہ رنگ ہے اشفاق
زندگی ہے سراب اور صحرا

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ اِک نگاہ کہ خالد سرِ نگاہ نہیں
مِرے بدن میں تو کیلیں سی گڑنے لگتی ہیں

غزلیں

کارِ بیکار سے نکل آئے
زخم تلوار سے نکل آئے

دل نے بے ساختہ اِرادہ کیا
رستے دیوار سے نِکل آئے

ہم بھی درویش بن کے پھرتے تھے
کام سرکار سے نکل آئے

عین ممکن ہے اِس اندھیرے میں
روشنی غار سے نکل آئے

میں نے آواز دی ستاروں کو
کتنے فنکار سے نکل آئے

لُطف لیتے ہوئے محبت کا
غم کے بازار سے نکل آئے

مجھ سے رُوپوش لفظ تھے امجد
کیسے اظہار سے نکل آئے

امجد بابر

رنگِ طومار سے نہیں نکلا
آدمی غار سے نہیں نکلا

پھول کی دل فریب خاموشی
شور بھی خار سے نہیں نکلا

دل جواری ہے تیری دُنیا میں
جانے کیوں ہار سے نہیں نکلا

حُسن اخلاق سے محبت سے
کام تلوار سے نہیں نکلا

کون لاتا ہے آب و دانے تک
راستہ ڈار سے نہیں نکلا

یہ جہنم ہے سات نسلوں کا
اور تُو نار سے نہیں نکلا

شاعری روشنی سی ہے امجد
میں سمن زار سے نہیں نکلا

غزل

ہاتھ گھما اور دھرتی پھینک
سب سے بھاری گٹھڑی پھینک

سُود بڑھے گا رکھنے سے
دنیا کو تو جلدی پھینک

دریاؤں نے رُخ موڑا
چپو توڑ کے کشتی پھینک

جس کے ہاتھ میں ڈوری ہے
اس نے دی گر چرخی پھینک؟

دل کو تیرے ہاتھ دیا
یار جہاں بھی مرضی پھینک

ریچھ نچا کے راشن لا
پھاڑ کتابیں تختی پھینک

اب یادوں کے جالے جھاڑ
بابر دل کی ردّی پھینک

احمد سجاد بابر

غزل

یہ کارِ زیاں جچتا نہیں دیدہ وروں پر
پاگل ہیں جو اتراتے ہیں بے کار غموں پر

تب سے ہے خفا جیسے مری ذات سے تتلی
اک شعر کہا تھا کبھی جگنو کے پروں پر

اس واسطے دھڑکن میں توازن نہیں باقی
اترا ہے صحیفہ ترے شہکار لبوں پر

آنکھیں ہیں کھلی پھر بھی نہیں دکھتا وہ چہرہ
کس کا ہے اثر دونوں طرف دونوں دلوں پر

کیونکر بھلا اتریں گی بلائیں کسی گھر میں
غازی کا علم سب نے لگایا ہے چھتوں پر

مرضی ہے اُدھورا جسے پورا وہ بنائیں
مامور نہیں کوئی میاں کوزہ گروں پر

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عشق کا فخر نہیں ، یکسر و یکتا ہونا
عشق ہے سب سے الگ ہو کے بھی سب سا ہونا

غزل

بھینی بھینی خوشبو جیسے لوگ کہاں ہیں
بُلھے شاہ اور باہو جیسے لوگ کہاں ہیں

ہر جانب ہی تاریکی اور مایوسی ہے
جگ مگ کرتے جگنو جیسے لوگ کہاں ہیں

ہم سے آج غزالی آنکھیں روٹھ چکی ہیں
جانے اب وہ آہو جیسے لوگ کہاں ہیں

جن کا لہجہ آج روایت کہلاتا ہے
نستعلیق سے اردو جیسے لوگ کہاں ہیں

اِک زنبیل میں ہر مشکل کا حل ہوتا تھا
لیکن اب وہ عمرو جیسے لوگ کہاں ہیں

وہ شیرینی ، لفظوں کا وہ سحر کہاں ہے
کوہ قاف سے جادو جیسے لوگ کہاں ہیں

مستانوں کی بستی آصف اُجڑ چکی ہے
مست قلندر مادھو جیسے لوگ کہاں ہیں

یاسر رضا آصف

غزلیں

بات کرنے کا حوصلہ کر لوں
ہو اجازت تو اک گلہ کر لوں

دل نہیں لگتا اس محبت میں
پھر پرانا وہ سلسلہ کر لوں

کیا ہوا دل کو یوں اچانک کہ
کہتا ہے اس سے فاصلہ کر لوں

آج تک تم نے فیصلے کیے ہیں
میں بھی اک بار فیصلہ کر لوں

زندگی ایک کھیل جیسی ہے
جینے کو میں بھی مشغلہ کر لوں

اک دعا ہے کلیم اور وہ یہ
پیار کو اپنا مسئلہ کر لوں

اب یہ مکان اپنے مکیں کا نہیں رہا
اے عشق تیرے بعد کہیں کا نہیں رہا

کتنا ہوا ہے ظلم یہ مجھ سے نہ پوچھیے
بس میں جہاں کا تھا سو وہیں کا نہیں رہا

وہ جو وفا کی بات ہی کرتا تھا رات دن
پیسے کے بعد وہ بھی زمیں کا نہیں رہا

پاسِ وفا میں پیار کا باقی تھا سلسلہ
ہاں آج کل زمانہ یقیں کا نہیں رہا

اتنے ملے ہمیں یہاں دھوکے کلیم کہ
اب تو یقین اک بھی حسیں کا نہیں رہا

محمد کلیم

غزلیں

دیوار میں دیکھا ہے کہ بن، جاتے ہیں در بھی
قیمت یہاں لگ جاتی ہے، بک جاتے ہیں سر بھی

یہ رونے سے چلانے سے، بنتا ہے تماشا
ہنس کے ہی کاٹا جائے، تو کٹتا ہے سفر بھی

کردار وہ موجود ہیں، اطراف میں تیرے
مانگے ہیں پناہ جن سے، شیاطین بھی، شر بھی

مل جاتے ہیں خوں کے بھی، خریدار ہزاروں
ہر آن مرے رہتا ہے ہم راہ، یہ ڈر بھی

لازم تو نہیں، سارے ہی مر جائیں بخاری
ہاں عشق میں ہوتے ہیں کئی لوگ، امر بھی

عاصم بخاری

تو مری جاں یہ بھول، رہنے دے
پیش کر اب نہ پھول، رہنے دے

ظلم بے بس پہ یوں نہیں ڈھاتے
یہ نہ اپنا اصول، رہنے دے

کھل چکی اب کے ساری اصلیت
بات کو دے نہ طول، رہنے دے

تربیت نام تک نہ ہو جس میں
سوچ ایسے سکول، رہنے دے

کھا نہ قسمیں یقین ہے مجھ کو
مجھ کو سب ہے قبول، رہنے دے

میں نے تیرے بغیر، رہنا ہے
یار مجھ کو ملول، رہنے دے

پہرے ہر سمت ہیں کڑے عاصم
شہر پہ ڈال دھول، رہنے دے

غزلیں

رات ہو جاتی ہے اور ضد پہ اڑی رہتی ہیں
میری آنکھیں تیری راہوں پہ لگی رہتی ہیں

راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہیں کتنے منظر
جتنی چنگاریاں سینے میں دبی رہتی ہیں

میں نہیں چاہتی جیتے جی زباں ان کو ملے
آرزوئیں تو مرے دل میں بڑی رہتی ہیں

کر لیا ترکِ مسافت کا ارادہ میں نے
منزلیں یوں تو بہت اور ابھی رہتی ہیں

خود کفالت کی وہ آسودگی حاصل ہے جیا
خواہشیں درد کا سامان بنی رہتی ہیں

جیا قریشی

آنکھ سے پانی بہہ جاتا ہے
صحرا بیچ میں رہ جاتا ہے

کاش سمجھ سکتی کچھ میں بھی
آنکھوں سے جو کہہ جاتا ہے

آ جاتے ہیں دوست عزیز
کچا گھر جب ڈھہ جاتا ہے

مت پتھر سمجھ اس کو
ظلم و ستم جو سہہ جاتا ہے

دیکھ لے جب اس کی آنکھوں میں
بندہ گم صم رہ جاتا ہے

کون جیا سمجھائے اسے
پیار تہ در تہ جاتا ہے

غزل

درمیانے لوگوں کی درمیانی خواہش ہے
اشکبار رہتے ہیں پھر بھی پانی خواہش ہے

میرے سارے دکھ میری مادری زباں میں ہیں
کوئی خوش بیاں کردے ترجمانی خواہش ہے

میں اگر سناؤں تو لگتی ہے حقیقت یہ
تجھ پہ فلمادوں اپنی یہ کہانی خواہش ہے

دونوں صورتوں میں موجودگی تری ہے شرط
ایک خط میں لکھ دی ہے، اک زبانی خواہش ہے

جس میں تیرے شعروں پر بات کرتے ہیں سب لوگ
ہاں مجھے بھی اس شب کی میزبانی خواہش ہے

ہم نہیں اٹھائیں گے ہجرتوں پہ اب آواز
ہم نے اس تناظر میں بس دبانی خواہش ہے

جس جگہ مقدر کو ترس کھانا پڑ جائے
میں نے اس جگہ ساگر لے کے جانی خواہش ہے

ساگر حضور پوری

غزلیں

یہ دنیا سے الگ میرا جہاں ہے
مسافر کو ستاروں کا گماں ہے

مری آنکھوں سے اس کو دیکھنا تم
محبت کی حقیقت اک دھواں ہے

جگر کے زخم کھلتے جا رہے ہیں
کہیں کوئی رفوگر کی دکاں ہے!

میں آغاز محبت میں مگن تھا
مگر انجام عبرت کا نشاں ہے

یہ غزلوں کی کتابیں کس لیے ہیں
خموشی بھی تو اندازِ فغاں ہے ؟

وہ کیسے لاتعلق ہو سکے گا
وہ جس کا ذکر زیبِ داستاں ہے

مسافر آج بھی لوٹا نہیں گھر
زمانے بھر میں یہ کیسی خزاں ہے؟

وہ تھا سائے کی پہنائیوں کے قریب
رتجگے آئے تنہائیوں کے قریب

اپنے ہی عکس کو مرتے دیکھا تھا جب
سب تھے اپنے ہی پرچھائیوں کے قریب

آج اس کی صدا روکتی نہ اگر
دشنہ تھا دل کی گہرائیوں کے قریب

وحشتوں کے جو اِلزام ہیں سب بجا
تھا مگر عشق رسوائیوں کے قریب

غرق گردابِ غم میں ہو گیا ہوں
تھا کبھی میں بھی اونچائیوں کے قریب

عبدالرؤف زین

غزل

شام کا تارا دیکھ کے ہم قسمت کو رونے لگتے تھے
صبح سویرے اٹھ کر پھر سے پتھر ڈھونے لگتے تھے

جنگوں کا موسم آتے ہی جشن منایا جاتا تھا
اور سپاہی خون میں لتھڑے خنجر دھونے لگتے تھے

مالِ غنیمت کی زمیلوں میں کچھ ایسے وعدے تھے
شام سے پہلے بستی بستی حملے ہونے لگتے تھے

صحرا میں اک سرخ اماری آگے آگے چلتی تھی
دم بھر آنکھ جھپکتی اور ہم رستہ کھونے لگتے تھے

ناقہ بانوں کو جلدی تھی اور ہمیں یہ عادت تھی
جنگل جنگل صحرا صحرا یادیں بونے لگتے تھے

انٹرنیٹ سے جامِ جم تک حیرت جب ایجاد ہوئی
سات سمندر پار کے قصے جادو ٹونے لگتے تھے

اک سیارے پر اترے جب، ہم کیسے قد آور تھے
اک بستی میں آنکھ کھلی تو بالکل بَونے لگتے تھے

پہلے پہل تو شہزادوں کی خاطر مسند بچھتی تھی
پھر کچھ دن میں وہ بھی اس مٹی میں سونے لگتے تھے

عہد جنوں یا عہد جوانی، جانے کیا بیماری تھی
اُن رستوں پہ کانٹے پتھر نرم بچھونے لگتے تھے

شہر پناہ کے اندر اک جادوگرنی کا افسوں تھا
دشمن خود اپنی آنکھوں میں تیر چبھونے لگتے تھے

عشق کی منزل آتے آتے سارے آہن چشم جواں
اپنے اشکوں سے پریوں کے پاؤں بھگونے لگتے تھے

عابد رضا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند جہاں بچھڑا تھا، وہ موڑ تو پھر آ نکلا
وہ صبح یہیں ٹھہری تھی، لمحات ہیں کچھ دیکھے سے

غزلیں

اس لیے کہتی تھی دو چار گھڑی رہ جائیں
میری آنکھیں ہی نہ رستے میں پڑی رہ جائیں

میں نے اک عمر لگا دی ہے گرانے میں جنہیں
حد ہے دیواریں اگر اب بھی کھڑی رہ جائیں

اپنے پیاروں کی طلب لے کے سفر لوگ کریں
اور میخیں مرے پاؤں میں گڑی رہ جائیں

قسمتِ دشت میں بارش سے نمو جاگ اٹھے
دیکھ کر آج وہ ساون کی جھڑی رہ جائیں

عنبرین اس نے بھی آسانیاں بانٹیں سب میں
میری قسمت میں تو شرطیں بھی کڑی رہ جائیں

عنبرین خان

جب ترا انہماک دیکھتی ہوں
بخت کو تابناک دیکھتی ہوں

آسماں تھے غرور میں جو لوگ
اب انہیں ہوتے خاک دیکھتی ہوں

ایسے شفاف ہیں مری آنکھیں
دامنِ دل کو پاک دیکھتی ہوں

روبرو سب حقیقتوں کے میں
منظرِ خوابناک دیکھتی ہوں

ریزہ ریزہ ہیں اہلِ درد مگر
ظلم کا اشتراک دیکھتی ہوں

زعمِ تکمیل تو بجا ہے مگر
گھومتا اب بھی چاک دیکھتی ہوں

زندگی عنبرین پیاری لگے
جب بھی ان کا تپاک دیکھتی ہوں

غزل

کیا مقدر میں لکھا ہے، کیا دیکھنا
جو بھی لکھا ہے اس سے سوا دیکھنا

نہ بھی چاہو گے پھر بھی کھنچے آؤ گے
ہاں محبت میں یہ مرتبہ دیکھنا

تم ہی روٹھے رہو، ہم مناتے رہیں
کب تلک یہ چلے سلسلہ دیکھنا

بس ہمارا ہی دل تم سمجھنا اسے
جب کہیں بھی کوئی در کھلا دیکھنا

مثل میری نہ ٹھوکر لگانا اسے
کوئی پتھر جو رہ میں پڑا دیکھنا

منزلِ شب کا تنہا مسافر ہوں میں
کیسے پاتا ہوں روشن ضیا دیکھنا

دل سے نکلی ہوئی آرزو تھی مری
عرش تک بن گئی ہے دعا دیکھنا

خالق آرزو

غزل

یہ پہلی بار نہیں ہو گا داستان کے ساتھ
کوئی یقیں سے نکلتا گیا گمان کے ساتھ

مجھے یہ ڈر ہے ادھر سے ادھر نہ ہو جائے
غبارِ زیست بھی رکھا ہے خاکدان کے ساتھ

یہ میرے صحنِ تخیل میں آتے رہتے ہیں
بنی بنائی ہے لفظوں کے خاندان کے ساتھ

نظر اٹھا کے کبھی دیکھ تو سہی ، کوئی
تری گلی سے گزرتا ہے کس گمان کے ساتھ

نجانے کس طرح دستِ دعا اٹھاتے ہیں
وہ لوگ جن کی نہیں بنتی آسمان کے ساتھ

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہاتھ سے لے نکل گئی، شور میں ضربِ ذات کے
ہم ہی تو گُر تھے، ہم ہی سَم، زمزمۂ حیات کے

غزلیں

بڑا سکون ملا دشت میں ہے گھر کی طرح
کوئی رفیق نہیں آدمی کا ڈر کی طرح

کہیں ثمر بھی اتارا گیا ہے پکنے سے قبل
کہیں پہ پیڑ گرا ہے کسی ثمر کی طرح

نہ چاہتے ہوئے بھی آدمی لپکتا ہے
ترے لبوں کی کشش تو ہے خونِ تر کی طرح

تمھارے ہجر میں دن بھی تو رات جیسا ہے
تمھارے آتے ہوئی روشنی سحر کی طرح

چمک زیادہ ہوئی جاتی ہے اندھیرے میں
تمام عمر چمکتے رہو گہر کی طرح

تمھاری مرضی ہے تم جس جگہ رہو جا کر
کوئی نگر نہیں ہے ویسے دل نگر کی طرح

سبھی نے چاند ستارے بنا لیے یوں تو
کوئی چمک بھی رہا ہے یہاں قمر کی طرح

قمر نیاز

کہنے کی حد تلک وہ پریشان ٹھیک ہے
صحرا نورد کو تو بیابان ٹھیک ہے
کوئی تو جانتا ہو ہمارے قیام کو
کوئی بھی مسئلہ نہیں پہچان ٹھیک ہے
ماحول شہر کا کوئی زنداں سے کم نہیں
رہنے کو ان دنوں میں تو زندان ٹھیک ہے
پہلے تو دل میں درد تھا اب درد ہو بھی کیا
دل آ گیا ہے تجھ پہ مری جان ٹھیک ہے
وہ عمر اب نہیں ہے مسائل بہت ہیں اب
مشکل پسندی اب نہیں آسان ٹھیک ہے
صد شکر بچ گئی ہے روایت نیاز کی
دونوں فریق مر گئے مہمان ٹھیک ہے

ویسے تو یاد داشت بھی نقصان دہ نہیں
صاحب کسی جگہ پہ تو نسیان ٹھیک ہے
قلت نہیں ہے قحطِ محبت ہے فی زماں
جو پیار مل گیا ہے مری مان ٹھیک ہے
ہجرت کا حکم جو ملے اپنے وسیب سے
رہنے کو پھر تو وادیِ مہران ٹھیک ہے
ایسے تباہ حال تو پہلے نہ تھے قمر
کہتے ہیں اب عوام بھی سلطان ٹھیک ہے

غزل

وہ جو ساحل پہ گھر بناتے ہیں
اپنے اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں

ہجر کی ٹہنیوں پہ جیون بھر
غم کے پنچھی ہی چہچہاتے ہیں

کتنا معصوم بےضرر ہے دل
لوگ پھر بھی اسے دُکھاتے ہیں

درد کے جان لیوا ہچکولے
پانیوں میں بھنور بناتے ہیں

تو بھی اور ساتھ تیرے بخشے ہوئے
زخم بھی مجھ کو یاد آتے ہیں

تجھ کو سمجھا تھا کیا تو کیا نکلا
خود فریبی پہ مسکراتے ہیں

ساتھ چلنے کی بات پر اکثر
کیوں ترے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں

کچھ نہیں رہتا فاصلوں کے سوا
فاصلے بیچ میں جب آتے ہیں

آئنے اور دل کے ربط سحر
بدسلوکی سے ٹوٹ جاتے ہیں

نادیہ سحر

غزلیں

زیرِ خود اور تجھ کو زبر کر لیا
تیرے پہلو میں لمحہ بسر کر لیا
ہم ملے تھے وہاں اس جہاں سے پرے
میں نے برزخ کا پھر سے سفر کر لیا
زندگی بھر کی یادیں بناتے چلو
سن کے تکوں نے خود کو شجر کر لیا
نام میرا ہو غالب سبھی کے لیے
زندگانی کو میں نے امر کر لیا
ہم نے باندھا تھا بازو پہ تصویر کو
آپ کے نقش نے کیا اثر کر لیا؟

عزیز قدیر مغل

تجھ کو معلوم ہے دل کے وہی حالات رہے
ہم تو یہ چاہتے تھے، تجھ سے ملاقات رہے
یاد میری تمھیں آئے کبھی دم بھرتے ہوئے
سوچ ہو اس کو جہاں، جاری یہ برسات رہے
تجھ کو معلوم ہے کیا تیرے چلے جانے سے
کس کا اب شہر بچا کس کے مضافات رہے
اب نہ ساقی کی نظر ہے نہ کوئی جام رہا
اپنی مستی کے لیے تیرے خیالات رہے
فکر ماضی کہ سوا اور بھی کچھ ہوتا ہے
یہ جو شاعر ہے بنا اس کو بھی صدمات رہے

رات ہوگی مری اب غموں کے لیے
صبر کر کے دکھوں کو ثمر کر لیا
خود کو اچھا سمجھ اور خوشیاں منا
تو نے اس دل کو میرا اگر کر لیا
تم نہ لوٹو گے واپس یہ معلوم ہے
کالی راتوں کو میں نے سحر کر لیا

وقت بدلا ہے تو، تُو نے بھی چھڑایا دامن
تیری یادوں سے بنے کچے مکانات رہے
ہم تو رسموں میں رہے سیکھتے سکھلاتے رہے
پیار ظاہر نہ ہوا تازہ یہ جذبات رہے
اس نے بدلا ہے ہمیں پھر کسی موسم کی طرح
ایک مالی نہ رہا اجڑے سے باغات رہے
سب ہیں اعلیٰ یہاں پھر کون ہے کمتر مجھ سا
اب یہاں کس کے لیے درس مساوات رہے

غزل

بانہیں خالی ہی رکھیں آپ کو بھرنے کے لیے
تشنگی ہم نے بچا لی اِسی جھرنے کے لیے

سب رقیبوں سے تو ہنس ہنس کے ملا کرتے ہو
اِک ہمی رہ گئے کیا مارنے مرنے کے لیے؟

بندہ پرور ! یہ محبت ہے، کوئی کھیل نہیں
کارِ دشوار ہے، جاں لگتی ہے کرنے کے لیے

ان گنت زخم اُدھڑتے ہیں، سِلا کرتے ہیں
ایک مصرعے کو غزل بن کے سنورنے کے لیے

شعر پر واہ نہ کر، اُس میں چھپی آہ بھی سن
داد سے کاسۂ بے داد کو بھرنے کے لیے

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

غزلیں

قسمت میں یہ نہیں تھا کہ ہم پر ہی وہ مریں
پھر یوں ہوا کہ ہم نے ہی مر کے دکھا دیا

حج پہ چلا رئیس اٹھا کے سوا کروڑ
اک ماں نے روتے بچے کو بھوکا سلا دیا

آمد سے ان کی نور کی برسیں گی بارشیں
ہم نے تو ہر چراغ ہے گھر کا بجھا دیا

بارش سے دوستی کا یہ کیسا ملا ثمر
پانی نے گھر کو میرے مکمل گرا دیا

ہارا تھکا جو آیا میں باہر سے ہو کے چور
روٹی نے ماں کے ہاتھ کی سب کچھ بھلا دیا

چھاؤں نے جس کی چار سو بانٹیں محبتیں
مالک نے آج بوڑھا شجر وہ گرا دیا

ثاقب وہ یاد کرتا تو ہوگا ہمیں بھی آج
ہم نے ہے جس کے واسطے خود کو بھلا دیا

ثاقب سیال

خدا نے فلک سے اتارا زمیں پر
مگر ہر سو پایا خسارا زمیں پر
زمینی خداؤں نے مجھکو ڈرا کر
غریب الوطن کر کے مارا زمیں پر
جدائی کا اس سے الم جا کے پوچھو
کہ بچھڑا ہے جس کا بھی پیارا زمیں پر
یہاں ہر قدم پر ہے نفرت ہی نفرت
خدا کو یہ کب ہے گوارا زمیں پر
فلک پر ہوئے چاند تاروں میں چرچے
کہ جب اس نے خود کو سنوارا زمیں پر

فرشتوں سے جیتا کرا کر میں سجدے
عمل سے ہوں اپنے میں ہارا زمیں پر
تمنائے جنت نہ حوروں کا طالب
سکوں چاہتا ہوں خدارا زمیں پر
کرم کر تو مجھ پر اے عرشوں کے مولا
ہے ثاقب نے تجھ کو پکارا زمیں پر

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد:

غالب نے کہا تھا کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔ ۱۹۹۲ء میں ایسا سخت سیلاب آیا جو قریباً ہر گھر پر دستک دے کر گزرا۔ سیلاب کا سیزن گزر چکا تھا۔ ضلعی انتظامیہ سکھ کا سانس لینے ہی والی تھی کہ وہ بلائے ناگہانی نازل ہوگئی۔ واپڈا نے حسب دستور تساہل اور تغافل سے کام لیا۔ انہیں اس بات کا قطعاً اندازہ نہ ہوا کہ کیچ میٹ ایریا میں زبردست بارشیں ہوئی ہیں اور پانی فیل بے زنجیر کی طرح چنگھاڑتا، چیتے کی طرح دوڑتا ہوا منگلا ڈیم کی طرف بڑھ رہا

ہے۔ ڈیم کو بچانے کے لئے ''سپل وے'' کھولنا پڑے اور اس طرح غیر متوقع بلا نے چار سو تباہی مچادی۔

سب سے بڑا خطرہ ملتان کو تھا۔ محکمہ انہار کے ماہرین کی متفقہ رائے تھی کہ چھ لاکھ کیوسک پانی کے لئے بنا ہوا بند بوسن بارہ لاکھ کے ریلے کو روک نہیں سکے گا۔ دریا کی بے لگام موجیں مٹی کے بند کو روئی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیں گی۔ شہر کے نشیبی علاقوں میں آٹھ دس فٹ پانی داخل ہو جائے گا اور ایک ایسی تباہی مچے گی جس کا اس سے پہلے اہلِ ملتان نے سامنا تو کجا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ سب سے زیادہ ڈر ''نوائے وقت'' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر شیخ ریاض کو تھا۔ اس نے عمر بھر کی کمائی سے بوسن روڈ پر کوٹھی بنوائی تھی۔ بند ٹوٹنے کی صورت میں سب سے پہلے اس پر پانی کا حملہ ہوتا۔ دن میں دس بار فون کر کے کہتا ''شاہ صاحب! مجھے بچائیں۔ عمر بھر کی کمائی اور پانی کے درمیان اُوپر خدا اور نیچے اس کا بندہ ڈپٹی کمشنر ہے۔''

گو بندوں کی حفاظت محکمہ انہار کا کام ہے۔ اس سلسلے میں زمین مضبوط کرنے کے لئے ایک خطیر رقم بھی مختص ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہلکاران بند سے زیادہ اپنے آپ کو معاشی طور پر مضبوط کرتے ہیں۔ بند ٹوٹنے کی صورت میں محکمے کو تو کوئی پوچھتا نہیں، ہر دشنام ہر اتہام اور تنقید کے تیر ڈی سی پر برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ڈی سی نے ہمیں بچایا نہیں ہے۔ کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ جانور بھوکے ہیں۔ حکومت کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ ہر بھوکے منہ میں نوالا ڈال سکے۔ ہر بے گھر کو چار دیواری مہیا کر سکے۔ نتیجتاً نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق وہ بھی احتجاجیوں کی ہم نوا بن جاتی ہے اور ڈی سی کی گوشمالی کرتی ہے۔

اس تناظر میں ہم نے ملتان کو بچانے کا تہیہ کیا۔ اپنی مدد آپ کے تحت ہزاروں لوگوں کو پٹواریوں کے ذریعے قریبی دیہات سے نکال کر بیلچے اور گینتیاں پکڑوا کر بند پر کھڑا کر دیا۔ ٹریکٹر ٹرالیوں کے ذریعے جہاں سے بھی مٹی دستیاب ہو سکی اکٹھی کی اور اسے بند پر ڈال کر پشتوں کو مضبوط کیا۔ احتیاطاً آبادی کے انخلا کا پلان بھی بنا ڈالا۔ ایک ہزار بسیں، ویگن، رکشے اور تانگے کالج گراؤنڈ اور ملحقہ سڑکوں پر کھڑے کر دیئے۔ قلعے میں ریلیف کیمپ لگایا۔ شہر میں جتنے خیمے، قناتیں، دریاں، کرسیاں اور برتن دستیاب ہو سکتے تھے اکٹھے کر لئے۔ جانوروں کے لئے شہر سے باہر زیرِ تعمیر کرکٹ اسٹیڈیم کو استعمال کیا۔ مخیّر حضرات کی مدد سے اپنی مدد آپ کے تحت فنڈ اکٹھا کیا۔ اپنی پوری سروس میں اس قسم کے تجربے یا صورت حال سے دوچار نہ ہوا تھا۔ ۷۲ میں لائلپور میں

آیا ہوا سیلاب اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اہل شہر اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ ریڈیو ملتان سے مجھے ہر گھنٹے کے بعد انہیں تسلی کا پیغام نشر کرانا پڑتا۔ ''آپ رات کو اطمینان سے سو جائیں، انتظامیہ جاگ رہی ہے۔'' اس عرصے میں مجھے ڈی سی مظفر گڑھ علی طاہر زیدی کا فون آیا۔ کہنے لگے ''کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے۔ اہل شہر کی نیند حرام کر دی ہے۔ یہ سیلاب نہیں چائے کی پیالی میں طوفان ہے، کچھ نہیں ہوگا۔ اب خدارا لوگوں کا خوف و ہراس کم کرو۔''

وہ سات یوم قیامت کے تھے۔ ہمارے امتحان کے دن تھے۔ نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند آتی تھی۔ عملاً میں نے اپنا دفتر بند روڈ پر قائم کر لیا۔ وزیر اعلیٰ نے دورہ کیا تو گھبرا گیا۔ اس قدر ٹرانسپورٹ، ساز و سامان اور وسیع پیمانے پر خوراک کا ذخیرہ دیکھ کر اسے حالات کی سنجیدگی کا اندازہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتان نے بچنا تھا، سو بچ گیا لیکن مظفر گڑھ ڈوب گیا۔ ناسخ ڈپٹی کمشنر کے گھر میں پانی داخل ہو گیا۔ ہر چیز کشتیوں کی طرح تیرنے لگی۔ لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شہباز شریف نے مظفر گڑھ کا دورہ کیا۔ ڈی سی پر برس پڑا۔ لوگوں کی موجودگی میں جو کچھ کہنا تھا کہہ ڈالا۔ زیدی صاحب کو چار گھنٹے میں مظفر گڑھ چھوڑنے کا حکم دیا۔ وائیں ملتان آیا تو وہ بھی ایئرپورٹ پر پھٹ پڑا۔

بولا'' I feel like hanging this deputy commissioner'' وہ شدید غصے میں انگریزی بولتے تھے۔

شیخ ریاض بولا ''اس کو تو پھانسی دینے پر تلے ہوئے ہو، لیکن جس نے ملتان بچایا ہے اس کو کون سا انعام دیا ہے۔''

کہنے لگے ''نیکی اور خدمت بذات خود بہت بڑے انعام ہیں۔ اس کے لئے کسی رسمی اعلان کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

ملتان سے گوجرانوالہ تبادلہ: منو بھائی نے جو بات مذاق میں کہی تھی، سچ نکلی لیکن اس کی وجہ ناراضی نہیں تھی۔ اخلاق تارڑ ڈی سی خانیوال کافی عرصے سے اس تاک میں تھا۔ اس کی بیگم نے مجیدہ وائیں کو شیشے میں اُتارا ہوا تھا۔ ان چکنی چپڑی باتوں کے باوجود ان کی دال گل نہیں رہی تھی۔ جب میرے تین سال مکمل ہوئے تو وائیں صاحب راضی ہوئے۔ مجھے سیکرٹری جی ایم سکندر کا فون آیا۔ وائیں صاحب نے پوچھا ہے کہ پنڈی یا گوجرانوالہ میں کہاں جانا پسند کرو گے؟ مجھے بھی احساس ہو چلا تھا کہ ملتان میں میرا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں ضلع بھی کچھ سکڑ گیا تھا۔ کانجو قریشیوں اور گیلانیوں کے سیاسی تسلط سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ اس

نے میاں نواز شریف کی منت سماجت کر کے لودھراں تحصیل کو ضلع بنوالیا۔ چوہدری نثار کی پنڈی والی پیشکش تو میں پہلے ہی ٹھکرا چکا تھا۔ ویسے بھی کسی سیاسی شخصیت کے زیر بار ہوکر نوکری کرنے کا مزہ نہ آتا تھا۔ چنانچہ میں نے گوجرانوالہ جانا مناسب سمجھا۔ ایک تو ضلع بہت بڑا تھا پھر اس وقت تک ضلع حافظ آباد اس کی ایک تحصیل تھی۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کی خوبی یہ تھی کہ شیخوپورہ کی طرح لاہور کے قریب تھا۔ بچے لاہور ایچیسن اور کنیرڈ میں پڑھ رہے تھے اس لئے آنے جانے میں بھی سہولت رہتی۔

تبادلہ ہوگیا تو جی ایم سکندر نے کہا "جتنی جلدی ممکن ہو، گوجرانوالہ پہنچ جاؤ۔" جب رانا صاحب سے اجازت مانگی تو انہوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

بولے "ناں بابا ناں - کل نواز شریف سیلاب زدہ علاقوں کا طوفانی دورہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی یا کمی کسر نکل آئی تو میں دھر لیا جاؤں گا۔ ریٹائر ہونے میں کچھ ماہ رہ گئے ہیں کیوں میرا مردہ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔"

رانا صاحب کا استدلال درست تھا۔ ان دنوں میاں صاحب کے سر پر دوروں کا بھوت سوار تھا۔ ہر متاثرہ گھر کی فہرستیں بنوائی گئیں اور پانچ ہزار روپے فی گھرانہ تقسیم کیے گئے - میاں صاحب ایئرپورٹ پر وزیروں کی فوج کے ساتھ اُترے۔ وزیراعلیٰ کے علاوہ غلام دستگیر خان، کانجو اور لالیکا اور چند مرکزی وزیر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ایئرپورٹ پر تین بڑے ہیلی کاپٹر پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ جہاز سے اُترتے ہی وہ مجھے ایک طرف لے گئے۔

بولے "آپ کا تبادلہ ہوگیا ہے؟"

"جی ہاں - آپ کی مہربانی سے میں گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں آپ نہ جائیں۔ ہمیں ملتان میں آپ کی اب بھی ضرورت ہے۔"

میرے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ کیا میاں صاحب کی منظوری کے بغیر میرا تبادلہ ہوسکتا تھا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ وزیراعلیٰ تبادلہ پر تلا ہوا ہے اور وزیراعظم کچھ اور سوچ رہا ہے۔ میرا ذہن ماؤف ہوگیا۔ صرف اتنا کہا "جناب! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی لیکن مجھے کچھ کہنے کا موقع دیں۔"

بولے "شام کو بات کریں گے۔ رات میں ملتان میں ٹھہروں گا۔ ابھی تو مجھے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کرنا ہے...... کہاں جانا پسند کریں گے؟"

"یہ میں نہیں بتاتا۔ میرے پاس نقشہ ہے۔ اس پر سے گاؤں دیکھ کر پائلٹ کو اُنگلی سے

اشارہ کر دیتا ہوں۔ ان کے خیال میں پہلے بتانے سے دورے میں ڈرامائی عنصر ختم ہو جاتا تھا۔ نیز انتظامیہ چوکس اور چوکنا ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلکاروں کو بے خیالی میں رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ اس طرح باز پرس اور سرزنش میں بھی مزا آتا تھا۔ ارباب اختیار جب بھی عوامی مجمع میں کسی سرکاری افسر کی بے عزتی کرتے ہیں وہاں موجود لوگ بھی ایک عجیب طرح کا حظ اُٹھاتے ہیں اور حکومت زندہ باد کے نعرے لگا دیتے ہیں۔

آرمی کے پوما ہیلی کاپٹر میں وزیر اعظم اور وزرا بیٹھ گئے۔ کمشنر کو بھی انہوں نے ساتھ بٹھا لیا۔ دوسرے میں ڈی آئی جی میجر مشتاق، میں اور جاوید نور ایس ایس پی (مرزا محمد علی کے تبادلے کے بعد ملتان میں وہ تعینات ہوا تھا) اور چند دیگر افسران بیٹھ گئے تیسرا ہیلی کاپٹر پرائیویٹ کمپنی کا تھا۔ اس میں صحافیوں کو بٹھایا گیا۔

جب ہیلی کاپٹر اُڑے تو مجھے تشویش ہوئی۔ سیلاب زدہ لوگ ہر حالت میں انتظامیہ کی شکایت کرتے ہیں۔ اتنے بڑے علاقے میں محدود وسائل کے ساتھ دیکھ بھال ممکن نہیں ہوتی۔ لوگ وارننگ کے باوجود گھر نہیں چھوڑتے۔ جب پانی مکان کو گھیر لیتا ہے تو پھر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمیں کشتیاں مہیا نہیں کی گئیں۔

اُڑتے اُڑتے طیارہ شجاع آباد کراس کر گیا۔ تھوڑا سا آگے جا کر اُس نے ایک گاؤں کے اردگرد چکر لگانے شروع کیے۔ نیچے دیکھا تو مجھے چکر آ گیا۔ وہ جلال پور کھاکھی تھا۔ پیپلز پارٹی کا گڑھ۔

''شوکت شاہ! برے پھنسے'' میں نے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ ان لوگوں نے شکایات کے انبار لگا دینے ہیں۔ ہو سکتا ہے چند مخالفانہ نعرے میاں صاحب کو بھی سننے پڑیں۔ میں نے اپنے پائلٹ کو کہا ''کیا ہم پہلے نہیں اُتر سکتے۔'' اس نے کاپٹر سکول گراؤنڈ میں اُتار دیا۔ پراٹوکول کے تحت وزیر اعظم کے ہیلی کاپٹر کو اُترنے سے پہلے تین چکر مکمل کرنا تھے۔ جب اہلِ دیہہ نے طیاروں کو دیکھا اور ان کی گڑگڑ سنی تو سارا قصبہ سکول کے میدان میں جمع ہو گیا۔ ہم باہر نکلے تو پیپلز پارٹی زندہ باد کے نعرے نے ہمارا سواگت کیا۔ مجھے اس کی توقع تھی۔ میں نے بآواز بلند کہا۔ میاں نواز شریف وزیر اعظم آپ کی مدد کرنے اور امداد دینے خود چل کر صرف آپ کے گاؤں میں آئے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا اچھا یہ بات ہے تو چلو نواز شریف بھی زندہ باد۔

میاں صاحب نے زندہ باد کے نعرے سنے تو بہت خوش ہوئے۔ گاؤں کی کچی گلیوں میں سے گزرتے گزرتے ہم باہر وسیع میدان میں

نکل آئے۔ گرد اور دھول سے سب کے چہرے اٹ گئے۔ سفید کپڑوں میں کوئی حصہ بھی ایسا نہیں تھا جس پر خاک کا خول نہ چڑھ گیا تھا۔ وائیں صاحب کا برا حال تھا ان کے لئے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں تھام رکھا تھا۔ میاں صاحب کچی دیوار پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے خطاب کرنا تھا۔ ہم نے میگافون کا بندوبست پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ جب ہم اُترے تو میری چھٹی حس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہاں تجربہ کام آیا۔ ایک معتبر شخص کو میں نے بازو سے تھام کر کہا میں ضلع کا ڈی سی ہوں، جو کچھ میں کہتا جاؤں تم ہاں کرتے جانا تمہیں انعام ملے گا۔

بولا ''جو حکم سرکار دا''

تقریر سے پہلے میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ فلڈ ریلیف کمیٹی کدھر ہے؟ بظاہر یہ بڑا بچگانہ سوال تھا۔ ہر تین گاؤں پر مشتمل ریلیف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں جن میں نمبردار سینئر ہیڈ ماسٹر، پٹواری امام مسجد وغیرہ شامل تھے۔ کسی کو بھی ان کی آمد کی اطلاع نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ پٹواری گرداوریاں کر رہا ہو۔ ہیڈ ماسٹر بچوں کو سکول میں پڑھا رہا ہو۔ نمبردار جھوٹی گواہی دینے ضلع کچہری گیا ہو اور امام مسجد صاحب وضو پکا کر رہے ہوں۔ ایک ممکنہ جواب تو یہ ہو سکتا تھا کہ انہیں کہا جاتا۔ میاں صاحب کیا بات کر رہے ہیں۔ پیشگی اطلاع کے بغیر اتنے سارے لوگ یہاں کیسے اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اگر اللہ دین کا چراغی جن بھی ہوتا تو اسے بھی سب کو یکجا کرنے میں کچھ وقت تو درکار ہوتا لیکن یہ انتظامی طریق نہیں ہے۔ نامعقولیت اپنی جگہ لیکن کوئی بھی فعال انتظامی افسر وزیراعظم کی جھنجھلاہٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے فوراً اس سفید پوش کو آگے کر دیا۔ یہ ہے ریلیف کمیٹی۔ وزیراعظم کے پاس سوچنے کے لئے وقت نہیں تھا کہ یک دم کیسے یک شخصی کمیٹی حاضر ہو گئی ہے۔ اچھا اچھا کہہ کر انہوں نے اس سے پوچھا ''کیا آٹا گھی، دال، چینی مل رہے ہیں؟''

''جی مل رہے ہیں'' وہ فٹ سے بولا ''ڈی سی صاحب نے تو دودھ اور گھی کی نہریں بہا دی ہیں۔'' میاں صاحب نے توصیفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ظاہر ہے مجھے تو انکساری دکھانا ہی تھی۔

کہنے لگے ''آپ کا حسن انتظام دیکھ کر سرپرائز کا عنصر ختم ہو گیا ہے۔ یہاں سے ہم جلال پور پیر والا جائیں گے۔'' حسن انتظام اپنی جگہ لیکن مقدر کا لکھا ٹل نہیں سکتا۔ میں جلال پور پیر والا پہنچ نہ سکا۔ جونہی وزیراعظم کے کاپٹر کے بعد ہمارا ہیلی کاپٹر اُڑا تو پائلٹ گرد و غبار میں سکول کی عمارت نہ دیکھ سکا۔ کاپٹر سیدھا ایک کمرے کی دیوار

سے جا ٹکرایا۔ ہمیں ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے نیچے سے توپ کا گولا مارا ہے۔ اب اسے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاز نہ تو دیوار پھاڑ کر کمرے کے اندر گھسا اور نہ اس میں آگ لگی۔ اس کی انڈر بیلی منڈھیر سے ٹکرائی تھی ہائیڈرالک سسٹم فیل ہو گیا اور کاپٹر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضا میں ڈولنے لگا۔ خوش قسمتی سے زمین سے بلندی زیادہ نہ تھی۔ ''جمپ، جمپ چھلانگ لگا دو'' فوجی چلائے۔ سب باری باری نیچے کود گئے، نرم کچی زمین تھی۔ پھر بھی کسی کا بازو ٹوٹا تو کسی کے ٹخنے میں موچ آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کاپٹر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وزیراعظم نے جب اُوپر سے یہ منظر دیکھا تو وہ فوراً نیچے اُتر آئے۔ ایک عجیب قسم کی یاسیت اور پژمردگی پھیل گئی۔ انہوں نے دورہ منسوخ کر کے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ کل اخباروں میں عجیب قسم کی خبریں چھپیں گی۔ نواز شریف ڈر گیا ہے۔ ہم پھنس ہی گئے ہیں۔ آپ جلال پور ضرور جائیں۔ انہوں نے میرا مشورہ مان لیا۔ چھ گھنٹے کے بعد ہمارے لئے دوسرا ہیلی کاپٹر آیا۔ جب ہم ملتان ایئرپورٹ پہنچے تو وہ روانگی کے لئے تیار تھے۔ پتہ چلا کہ اس اثنا میں وائیں صاحب جھاڑ کھا چکے تھے۔ جب سرکٹ ہاؤس میں نہانے کے بعد انہوں نے پرفیوم مانگی تو وزیراعلیٰ کو احساس ہوا کہ نہانے کے بعد یہ عمل بھی کیا جاتا ہے۔ وائیں کے لئے تو ہم نے آملہ ہیئر آئل بھی کبھی نہ رکھا تھا، وزیراعظم کے لئے سب کچھ تھا۔ پرفیوم اس لئے نہ رکھی تھی کہ ہر بڑے آدمی کی اپنی پسند کی خوشبو ہوتی ہے جو اکثر اس کا عملہ بریف کیس میں ساتھ لاتا ہے۔ میاں صاحب کو بیس کورسز کا ناشتہ کرانے والے ایک کلون کی مار کھا گئے تھے۔ ایئرپورٹ پر روانگی سے قبل میں نے پوچھا ''میرے لئے کیا حکم ہے؟''

بولے ''رات بارہ بجے مجھ سے فون پر بات کرو۔''

رات کو فون کیا تو کہنے لگے ''کل پنڈی آ جاؤ۔ بیٹھ کر بات کریں گے۔'' میں عجب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ وائیں صاحب اصرار کر رہے تھے کہ فوراً چارج چھوڑ دوں۔ وزیراعظم کی سوچ مختلف تھی۔ وزیراعظم کو ملنے کے لئے وزیراعلیٰ کی منظوری ضروری تھی۔ میں نے خود تو بات نہ کی لیکن حامد رضا گیلانی کے ذریعے کہلوایا کہ میاں صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ جب ان کی اجازت ملی تو میں پنڈی پہنچ گیا۔ وہاں افضل حسین تارڑ کے پاس ٹھہر گیا۔ تین دن گزر گئے لیکن ملاقات نہ ہو پائی۔ صبح جاتا تو عملہ کہتا بھلوال گئے ہیں شام کو ملو، شام کو فون کرتا تو جواب ملتا، صبح کوشش کرو۔

اسی شش و پنج میں میں اپنے کلاس فیلو چیئرمین سینٹ وسیم سجاد کے پاس بیٹھا تھا کہ نذیر سعید آیا اور کہنے لگا ''وائیں صاحب نے کہا ہے کہ ان سے فون پر بات کرو۔''
میں نے کہا ''تم نے مجھے تلاش کیسے کیا ہے؟''
اس پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا لیکن میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وسیم سجاد کے دفتر سے وزیراعلیٰ کو فون کیا وہ خود تو موجود نہ تھے۔ البتہ جی ایم سکندر نے ان کا پیغام دے دیا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھے اور ان کا حکم تھا کہ Prime minister or no Prime minister میں فوراً جا کر گوجرانوالہ میں چارج لوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کون سا شخص ہے جو میرے خلاف سازش کر رہا ہے اور آخر میری وزیراعظم سے ملاقات کیوں نہیں کرائی جاتی۔ میں زچ ہو کر سیدھا وزیراعظم ہاؤس چلا گیا۔ لابی میں چوہدری شجاعت حسین بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میاں صاحب منڈی بہاؤالدین جا رہے تھے۔ وہ لابی میں آئے تو میں نے کہا ''سر! میں تین دن سے انتظار کر رہا ہوں۔''
مسکرا کر کہنے لگے ''شام کو بات کریں گے۔'' وہ تو چلے گئے لیکن ان کے عملے نے مجھے انار جوس کا ایک گلاس پلایا۔ ابھی میں دوسرے گلاس کا سوچ ہی رہا تھا تو اس نے ٹھک سے سوٹ مارا اور ہتھیلی کھجلانے لگا۔ میرے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے اشارہ کیا کہ ٹپ مانگتا ہے۔ میں نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی جلتی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کا ہلنا تھا کہ دوسرا بیرا آ گیا۔ بے داغ میرون کلر کی شیروانی، سفید کفی دار پگڑی، مائع لگی کورے لٹھے کی شلوار۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ بالکل کسی جاگیر کا مالک لگتا تھا۔ اسے بھی پانچ سو روپے دینے پڑے۔ پیشتر اس کے کہ تیسرا اورنج جوس لے کر آتا میں بھاگ کھڑا ہوا۔ جب میں کوریڈور سے نکل رہا تھا تو میاں شہباز شریف کی آواز سنائی دی۔ وہ بیروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے۔ وہ انہیں ٹھنڈی مچھلی کھلانے کی گستاخی کر بیٹھے تھے۔ بولے ''اگر تم لوگوں کا یہی رویہ رہا تو میں میاں صاحب سے تمہاری شکایت لگا دوں گا۔'' مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں ہزار روپے کا معاملہ کس کے حضور پیش کروں۔
شام کو پتہ چلا کہ موسم خراب ہو گیا ہے اور وزیراعظم صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔ صبح انہیں چین جانا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید شاہ کو کہا کہ تم لوگوں نے مجھے تین دن سے لٹکا رکھا ہے۔ آخر عزت سادات بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں چاہو تو کل مجھے اوایس ڈی لگا دینا۔

[جاری ہے۔]

''کتنے موسم خواب ہوئے.....ایک تاثر

طارق بٹ کی شاعری کا ایک ہلکا سا تاثر ان کی ان غزلوں سے میرے ذہن میں اس وقت مرتب ہوا جب ماہ نامہ ''فانوس'' میں ان کی غزلیں اشاعت کے لیے آئیں اور وقتاً فوقتاً ''فانوس'' کے بعض شماروں کا حصہ بنیں۔ تاہم مجموعی اور بھرپور تاثر کے لیے میرے سامنے ان کا کوئی مجموعہ نہیں تھا۔ اسے میری نارسائی کہہ لیجے یا کوتاہی کہ خواجہ رضی حیدر اور نوید صادق کے دیباچوں سے معلوم ہوا کہ ''کتنے موسم خواب ہوئے'' ان کا تیسرا مجموعہ ہے اور اس سے پہلے ان کے دو مجموعے اشاعت کے مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ کسی بھی کتاب کے دیباچے کا مقصد--- کسی اور کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا--- میرے نزدیک اس کی فضیلت یہ بھی ہے کہ اصل کتاب پڑھنے والے کے لیے ایک سمت مہیا کر دیتا ہے۔ فضیلت کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ کتاب پر دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے کی آرزو خود صاحبِ کتاب کی ہوتی ہے اور اس کے نزدیک جس لکھنے والے کی اہلیت زیادہ ہو سکتی ہے، وہی دیباچہ نگاری کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ سو اس مجموعے کے صاحبانِ فضیلت خواجہ رضی حیدر اور نوید صادق ہیں اور علمی و ادبی لحاظ سے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان اصحاب کی تنقیدی حسیات اور کسی فن پارے کو پرکھنے کی صلاحیت ہمارے بہت سے لکھنے والوں کے مقابل کہیں زیادہ ہے، یوں متذکرہ کتاب کے دیباچے یا تقریظات کا تنقیدی و تجزیاتی پہلو لائق اعتبار ہی نہیں، بہت اعلیٰ سطح پر محسوس کیا جا سکتا ہے، بلکہ محترم نوید صادق صاحب نے ''کتنے موسم خواب ہوئے'' کی تخلیقی

خالد علیم

پیش کش کو پوری عرق ریزی اور اپنے منصفانہ تنقیدی عمل کے ساتھ رقم کرتے ہوئے اپنی تنقیدی صلاحیت کے نقوش زینتِ قرطاس کر دیے ہیں اور اس سے آگے بڑھنا مجھ جیسے ہیچ مداں کے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور دکھائی دیتا ہے۔

مگر--- کیا کیا جائے کہ انسانی طبیعتوں میں ہمیشہ ایک تضاد واقع ہوا ہے، پسند اور ناپسند کا معیار بھی مختلف ہو سکتا ہے اور دیکھنے پرکھنے کی اہلیت بھی کہیں دوسرے سے کمتر تو ہو سکتی ہے مگر زاویہ نظر میں اختلاف کی گنجائش بھی اگرچہ موجود رہتی ہے، تاہم دیباچہ اپنے پڑھنے والے کے لیے جو سمت مہیا کرتا ہے عمومی زاویہ نگاہ سے وہی سمت مصدقہ تجزیاتی میزان میں بھاری دکھائی دیتی ہے، سو جب میں نے ''کتنے موسم خواب ہوئے'' کی یہ تقریظات یا دیباچے پڑھے تو مجھے اس تجزیاتی رو کے بہاؤ میں اس سے آگے نکلنا دشوار دکھائی دینے لگا۔

اب اگر کہیں میں ان کی موافقت اور تجزیات کی تائید میں اپنا تجزیہ پیش کرتا ہوں تو بار بار قلم رُکتا ہے، مگر پھر یہ امر بھی موجبِ تسکین ہے کہ آخر کچھ تو مجھے بھی کہنا ہے۔

طارق بٹ نے اس مجموعے کی شاعری کے لیے جو عنوان مقرر کیا ہے، اس کا تعلق بظاہر خواب کی علامت سے جڑا ہوا ہے مگر یہ خواب، خوابِ بے تعبیر ہے جس نے کتنے ہی سرد و گرم موسم گزار دیے اور شاعر کی

شعوری رَو نے اس سے جو معنویت اخذ کی ہے وہ رائیگانی کا احساس دلاتی ہے۔ یہ احساس سماجی تناظر میں دیکھا جائے تو انسانی رویوں کی سرد مہری اور بے حسی کو سامنے لاتا ہے۔ مثلاً یہ شعر کہ:

کیا بگولے سا سرِ دشت اُڑاتا ہے غبار
آ: بھرے شہر میں لا، شوق کی رسوائی کو

....

انسانی معاشرہ اور اس میں بسنے والے فرد کی تنہائی، اور اس تنہائی کے اکیلے سے دو چار وحشت کے بگولے میں بھی شاعر کا دل دھڑکتا ہے اور اس میں اسے اپنی کیفیتِ جنوں دکھائی دیتی ہے، بظاہر بگولا، دشت، غبار ایک ہی مصرعے میں صوتی و معنوی اعتبار سے اہم آہنگ ہو کر مصرعۂ ثانی سے تلازماتی صورت اختیار کرتے ہیں، مگر مفہوم کے اعتبار سے شاعر کا بنیادی مقصد اس تحرک سے ہے جو ''شوق کی رسوائی'' گویا دوسرے معنی میں انسانی خواہشات کے دائرۂ فکر میں حرکی تصور پیدا کرتا ہے جس سے شاعر کا تخیل اپنے تخلیقی مظاہر میں اس سعی و عمل کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے جو اسے نہ صرف شوق پر ابھارتا ہے بلکہ عینِ حقیقت اور خود فراموشی کے بجائے خود آگہی کا صورت گر بھی ہے۔ یہاں مجھے غالب کا شعر یاد آ گیا:

ڈ ے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

''قطرہ و موج و حباب'' وجودِ بحر کی ظاہری شکلیں ہیں، اس کا اصلی وجود اس بلاخیزی سے ہے جو سمندر کے مدوجزر سے پیدا ہوتی ہے۔ طارق بٹ کے شعر میں بھی بگولا، دشت، اور غبار، صحرا کی ظاہری صورتیں ہیں مگر ''شوق کی رسوائی'' دشت میں ممکن نہیں بلکہ اس رسوائی کا اصل مظاہرہ انسانی معاشرے ہی میں ہوسکتا ہے جہاں انسان کی ضروریات اور ان سے جڑے ہوئے احساسات کے برعکس انسانی حسیات پر قدغن لگا رکھی ہے اور ایک جمود کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

طارق بٹ کی شاعری پر بات کرتے ہوئے مجھے اس ایک شعر کی کیفیت نے گھیر لیا اور میں اس کے دروبست میں کھو کر قدرے ''حکایت دراز تر گفتم'' کی کیفیت میں چلا گیا، مقصد یہ تھا کہ ان کی شاعری کے ایک فطری آہنگ، ظاہری اور باطنی خدوخال کی آراستگی اور ان کے تخلیقی رجحانات کا اندازہ کیا جا سکے۔ چناں چہ میں دیکھتا ہوں کہ طارق بٹ کی شاعری بالخصوص اس کی غزل کا فطری آہنگ اور معنوی تناظر عہدِ موجود کی عام روش سے کہیں بہت جدا بھی ہے اور کہیں کہیں کلاسیکی روایت کی عکاسی کرتا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ عصرِ موجود کے سب نہیں، بیشتر نوجوان شعرا نے کلاسیک کو اس نظر سے پڑھا ہی نہیں کہ جس سے رتی بھر جمالیاتی حسن کاری نظر آتی ہو، لایعنی جدت اور خود کو منفرد منوانے کے لیے ایسے ایسے تخلیقی مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ طبیعت بوجھل ہونے لگتی ہے۔ مگر طارق بٹ کی غزل کا تخلیقی آہنگ منفرد اور جدید ہونے کے باوجود کلاسیکی جمالیات سے بے بہرہ نہیں اور ان کے مجموعے سے کئی اشعار اس حوالے سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ بقول نوید صادق:

''ان کی مجموعی شاعری میں فکری رچاؤ اور اظہار و بیان کی سلاست اور وسعت میں ترفع دکھائی دیتا ہے۔ یہ ترفع ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ شاعر نہ صرف اپنے تخلیقی رویہ میں سنجیدہ ہے بلکہ اپنی شعری روایت سے بھی جڑا ہوا ہے۔''

تاہم ذرا آگے بڑھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''طارق بٹ کی شاعری کہیں بھی رسمی و روایتی حدود میں مقید نہیں۔ مجھے ''کتنے موسم خواب ہوئے'' میں ''صدائے موسمِ گل'' اور ''بدلتی رتوں کی حیرت'' سے کئی قدم آگے بڑھتی ایک نئی چمک دمک، ایک نیا اسلوب نظر آرہا ہے۔''

''صدائے موسمِ گل'' اور بدلتی رُتوں کی حیرت'' میرے سامنے نہیں مگر ''کتنے موسم خواب ہوئے'' کی شاعری میں، جس پر مجھے آج بات کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے، بلاشبہ رسمی و روایتی حدود میں مقید نہیں، مگر اس شعری روایت کو ساتھ لے کر ضرور چلتی ہے جو اردو شاعری کی جان دار روایت ہے

اور جس کے بغیر غزل میں تاثیر کا عنصر داخل نہیں ہوسکتا۔ رمزیت و اشاریت غزل کی اہم خصوصیات ہیں، اگر غزل میں یہ خصوصیات اپنے تمام فنی و معنوی لوازم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تو غزل محض ایک سپاٹ بیانیہ بن کر رہ جاتی ہے۔ طارق بٹ کا تخلیقی شعور غزل کی اس رمز سے پوری طرح آشنا ہے بلکہ اپنی تخلیقی پیش کش میں اسے پورے ترفع کے ساتھ شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح برتنے پر قادر ہے۔ میں یہاں چند شعر بطور حوالہ پیش کرنا چاہوں گا:

میرے تنہا، مرے یکتا، یہ ترا اِسم ہے جو
ہوا سرنامہ، مرے شجرۂ تنہائی کو

رقص کرتا ہُوا چل بامِ تمنا کی طرف
کچھ تماشا تو دِکھا اپنے تماشائی کو

دیوار کھینچے جاتا ہے، در کر نہیں رہا
کیا ہو گیا ہے دل کو، خبر کر نہیں رہا

جلائے دیتی ہے ہم کو، یہ زندگی کی لو
چراغِ جاں تہِ داماں، ہوا دیا گیا ہے

دن گزرتے پتا نہیں چلتا
کیا روانی ہے ماہ و سال کی بھی

آئنوں میں آئنہ، شہرِ حلب کا آئنہ
لیکن اپنا دل بھی یارو، ہے غضب کا آئنہ

جانے کس زندگی کی خواہش میں
ہم اِدھر، تم اُدھر رہے آباد

آج: اچانک، ترا خیال آیا
اور آیا، بڑی ہی شدّت سے

ہے کوئی ذات میاں، وحشت و جنوں کی بھی
تلاشیے گا، جو نام و نسب کہیں مل جائے

.....

یہ چند شعر مجموعے کے محض ابتدائی اوراق سے لے لیے گئے ہیں، جسے بہرحال انتخاب نہیں کہا جاسکتا ہے اور کہیں انتخاب کا شائبہ محسوس ہو تو اس میں ذاتی پسندیدگی کا مسئلہ بنیادی ہے جب کہ میری نظر میں ایک کڑا انتخاب کیا جائے تو سماجی اور عصری صورتِ حال اور ان کی دلی وارداتِ کے آئینے میں مجموعے کے آخر تک کتنے ہی شعر ایسے نظر آتے ہیں جو طارق بٹ کے شعری معیار کو بلند تر رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر طارق بٹ کا شعری آذوقہ، جو ان کی شعوری اور لاشعوری کاوشوں کا حاصل ہے، بہت دیر تک وابستگانِ شعر کو اپنی تخلیقی جمالیات سے سرشار کرتا رہے گا۔ اس کا ایک ایک مصرعہ اور شعر معنوی اعتبار سے بھی ان کی ترفع خیالی کا مظہر ہے جس کا خیر مقدم پورے صدقِ دل سے پوری ادبی دنیا میں کیا جانا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

ارشد ملک کا حج نامہ ''حاضر اللہ سائیں''

ارشد ملک جیسے عزیز دوست اور راولپنڈی اسلام آباد کی ادبی محفلوں کی رونق کی پہچان ایک اچھے شاعر اور ایک عمدہ ناشر کی حیثیت سے تو گذشتہ کئی عشروں سے ہے، مگر جب اُس نے حج کا سفر نامہ لکھا تو اُسے پڑھ کر اُس کے اندر کئی تہوں میں چھپے ہوئے ایک صاحبِ ایمان، اللہ کے بندے اور عاشقِ رسولؐ سے ملاقات ہوئی- اس کے اس سفرنامے کو میں 'حج نامہ' اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ محض ایک سفر نامہ ہی نہیں اور محض حج کے دنوں ہی کی کیفیات کی روداد نہیں، بلکہ اس کی، اس کی شریکِ حیات کی اور اُس کے اِردگرد کے ماحول کی کیفیاتی ترجمانی کرتی ہوئی ایک عرفانی اور روحانی روداد ہے- ایسا لگتا ہے کہ 'حج نامہ' میں اُس نے بہت سے نامے اپنے اللہ کے نام، رسولِ کریمؐ کے نام انفرادی اور اجتماعی طور پر لکھے ہیں اور ان میں عقیدتی اور مناجاتی انداز کے علاوہ امتِ مسلمہ کا اور ارضِ وطن کا استغاثہ بھی پیش کیا ہے-

ارشد ملک کی نثر نگاری کے اس حسن اور اپنے دل کی کیفیات کو سلیقے اور قرینے سے بیان کرنے کی یہ صلاحیت میرے علم میں پہلی بار آئی ہے اور اِس پر مَیں اسے جتنی بھی دادو تحسین سے نوازوں کم ہو گا کہ ان تمام کیفیات میں حرمین شریفین، دیگر مقاماتِ مقدسہ کا منظر نامہ بھی اُس نے اس کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اُس کی یہ نثر کہیں کہیں نثری نظم کی طرح مرصّع لگنے لگتی ہے-

ارشد ملک کے اندر ہمیشہ سے ایک درویش صفت شخص چھپا ہوا تھا جو اس سفر نامے میں کئی جگہوں پر ظاہر ہو رہا ہے مثلاً ابتدائیہ میں ہی وہ لکھتا ہے ''سارا دن کتابوں سے باتیں کرنے کے بعد جب اکثر ڈھلتی ہوئی شام مجھے شاعری سے گلے ملنے پر اکساتی ہے تو میں چھوٹے سے سفر پر روانہ ہو جاتا ہوں، کمیٹی چوک سے نیشنل ٹی ہاؤس- دوستوں کو کیا خبر کہ ان تک پہنچنے سے پہلے مجھے بہت سی روحوں سے باتیں کرنی پڑتی ہیں، راستے میں موجود قبرستان اور ''بابا شاہجہان'' کے مزار سے اڈنے والی ہوائیں میرے وجدان پر دستک دیتی ہیں اور ابدی زندگی کے بارے میں بتاتی ہیں''- اس نے اپنے اور کچھ احباب کے خوابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں انہیں بتایا گیا کہ ارشد تو حج پر گیا ہوا ہے- ایسے خواب اسے حج پر جانے

نسیمِ سحر

سے بہت پہلے دکھائی دیتے تھے جن میں وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوتا ہے اور جن کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ "وہ منظر، وہ خوشبو، وہ روشنی، مَیں جاگنے کے بعد بھی کئی سال تک محسوس کرتا رہا"۔ یقیناً جب وہ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا تو اُسے یہ منظر، یہ خوشبو اور یہ روشنی نامانوس نہیں لگی ہو گی۔ اور خوابوں کے حوالے سے اس نے یہ حدیث بڑے عجز سے بیان کی ہے جس میں آقاؐ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ "سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے"۔

کمال یہ کہ اس کتاب میں اُس نے کئی جگہ یہ اعتراف کیا ہے کہ اُس نے حج کا سفر اپنی بیوی کے اصرار پر اختیار کیا۔ لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ ارشد ملک کو اصل میں بُلاوا اُدھر ہی سے آیا تھا اور اپنی شریکِ حیات کے توسّط سے آیا تھا، اس کا یہ حج کا سفر کوئی جبری نہیں، اختیاری سفر تھا اور اس حج نامے میں اس کی کیفیات کچھ ایسی ہیں کہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ اُسے وہاں بلایا گیا تھا، طلب کیا گیا تھا، بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کسی بندے کو براہِ راست بلانا مناسب نہیں سمجھتے تو کسی دوسرے وسیلے سے اسے بلایا جاتا ہے۔

اس کی کتاب کا انتساب ملاحظہ ہو جو اس کے محبِ رسولؐ ہونے کے علاوہ اس کی والدہ محترمہ مرحومہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے: "معلمِ اعظم کے نام، انتساب (۲): اس روح کے نام جس نے میری والدہ کے بدن میں اس وقت تک قیام کیا جب تک اس سفر نامے کی آخری سطر پر اس کی سماعتوں نے خوشی ثبت نہیں کی۔"

ارشد ملک نے حج کے سفر پر جانے سے قبل کیا تیاریاں کی تھیں اس بارے میں معروف نعت گو شاعر شرف الدین شامی دیباچے میں قلم برداشتہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"ارشد ملک اللہ سائیں کے روبرو پیش ہونے سے پہلے بھی اس کے حضور حاضر ہو چکا ہے اور ابھی تک حضوری کے دائرۃ الاثر میں ہے، وہ ایک ایڈونچر کرنے جا رہا تھا اس لیے اس نے پہلے ہی حرمین شریفین پر بہت سا معلوماتی مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اس سے پیشتر اس نے اس سفر کے بارے میں سنجیدگی سے کبھی نہیں سوچا، اسے شریکِ حیات کے مسلسل اصرار نے مکہ مدینہ کی سمت بکھرتے ہوئے راستوں کی طرف مائل کیا جو بیت اللہ کے انوارات سے پہلے بھی سرشار ہو چکی تھیں"

ایک اہم بات یہ ہے کہ ارشد ملک نے حج پر جانے سے پہلے ہی تیاری کی اور اس سفر کی روداد قلمبند کرنے کا خیال اسے روانہ ہونے سے قبل بھی تھا، اسی لیے وہ روزانہ کی بنیاد پر اپنے سفر کی کیفیات، محسوسات اور روحانی واردات کو قلمبند کرتا رہا جس نے بعد میں مزید صیقل ہو کر ایک حج نامے کی صورت اختیار کر لی۔ رسولؐ کو بجا طور پر معلمِ اعظم کا خطاب دیتے ہوئے اس نے ان کے ایک متعلم کی حیثیت سے اپنے قلم میں اجالے بھر کر اپنی نثر میں حرمین شریفین کی مناسبت سے بلیغ استعارے، اشارے، کنائے اور تلازمے برت کر اپنی معجز بیانی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مطالعے میں آنے والے بہت سے

گذشتہ حج کے سفرناموں کے موازنے سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ ارشد ملک نے ایک جدا لہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے یہ سفرنامہ کچھ اتنی تفصیل سے اور مستند معلومات اکٹھی کرنے کے بعد لکھا کہ اس کی ضخامت کوئی آٹھ سو صفحات تک پہنچ گئی، مگر کئی سال تک اس مسودے پر نظر ثانی کرنے کے بعد اس نے اس کا جو فائنل مسودہ اشاعت کے لیے تیار کیا اس کی کچھ رُوداد اُسی کی زبانی ملاحظہ ہو:

''میں نے آخری بار جب سفرنامے پر کام دوبارہ شروع کیا تو جو لکھتا اپنی والدہ کو سناتا۔ سنانے کے دوران اور سنانے کے بعد میں ان کے چہرے کے تاثرات بھی نوٹ کرتا۔ والدہ تو کبھی حوصلہ شکنی نہیں کرتیں مگر مجھے بڑا کام کرنے جانا تھا، اس لیے بار بار سوچنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے جس تحریر پر والدہ کی جانب سے شاباش ملتی اور والدہ جس تحریر کو سن کر زیادہ خوش ہوتیں اور بوریت بھی محسوس نہ کرتیں، میں اس تحریر پر ''گڈ'' کا نشان لگا کر اپنے آپ کو سو میں سے سو نمبر دے دیتا۔''

ایک منفرد لہجے کا شاعر ہونے کے ناتے اس نے اس سفرنامے میں بھی جا بجا اپنے خوبصورت غزلیہ اشعار اور نظمیں درج کی ہیں۔ اس کی یہ مختصر نظم ملاحظہ ہو جس میں وہ اپنی کیفیات کا اظہار ایک دھمالی کیفیت میں کر رہا ہے:

یوں اپنی خاک پہ چل چل کر
ہم راہ میں تیری گرد ہوئے
پھر روح ہماری سبز ہوئی
پھر جسم ہمارے زرد ہوئے
ہم خاک نشینوں کے دم سے
آباد تری درگاہ پیا
ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا
پھر بھید کھلا اک دن ہم پر
اس دل میں کہیں موجود ہے تو
ہر دھڑکن تیری شاہد ہے
ہر دھڑکن کا مشہود ہے تو
آباد ہے تیرے جلووں سے
احساس کی یہ درگاہ پیا
ہمیں مار گئی تیری چاہ پیا

.....

ارشد ملک کا یہ سفرنامہ تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے نہیں بلکہ کیفیات کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے، ایک ہی باب میں وہ مکے میں بھی موجود ہوتا ہے اور مدینے میں بھی اور دیگر مقاماتِ مقدسہ پر بھی، دراصل وہ مقاماتی کے بجائے کیفیاتی اور عقیدتی تسلسل برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ اس کی تحریر کے کچھ ذیلی عنوانات بھی قابلِ ذکر اور تجسس میں مبتلا کرنے والے ہیں جنہیں پڑھ کر کتاب کا وہ حصہ فوراً پڑھنے کی بے تابی جاگ اٹھتی ہے، مثلاً ہاتھیوں کے درمیان ایک مشاعرہ، میں جنت البقیع میں دفن ہو گیا، میں اُحد پہاڑ سے ہم کلام تھا، بنگالی بابوں کی باتیں اور تختی، تعمیری سپیڈ اور تخریبی سپیڈ، بغیر کنکریوں کے شیطان سے مقابلہ۔

ارشد ملک کے سفرنامے کا ایک خاص پہلو اُس کی زندہ دلی اور شگفتہ بیانی ہے۔ وہ کئی جگہوں پر اپنی عمدہ حسِ مزاح کا اظہار خوبصورت جملوں سے کرتا ہے اور اس

کی یہ زندہ دلی کسی طور بھی شائستگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر کا رُخ نہیں کرتی۔ مسجد جن میں داخل ہوتے ہوئے لکھتا ہے "جب میں مسجد جن میں داخل ہوا تو مجھے جنات کا خیال بالکل بھی نہیں رہا۔ ویسے بھی عام بات مشہور ہے کہ شاعروں سے تو جناب بھی پناہ مانگتے ہیں"۔ ایک مقام پر رش کی وجہ سے حادثے سے بال بال بچنے کے بعد لکھتا ہے: "ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم بچ گئے اور شیطان کو سنگسار کرنے پہنچ گئے۔ اگر ہم بھی اس حادثے کا شکار ہو جاتے تو جنت میں مَیں اپنی بیگم کو کسی شہد کی ندی کے کنارے بیٹھ کر میر تقی میر کا یہ مصرع سنا رہا ہوتا:

مناسب تھا نہ جانا اس گلی میں بار بار اپنا"

.....

ارشد ملک کے اس حج نامے میں کئی جگہوں پر خود سے ہم کلامی کی اور کئی جگہوں پر خدائے بزرگ و برتر سے ہم کلامی پر مبنی خوبصورت عبارتیں اس حج نامے کی ادبی و تخلیقی تزئین میں اضافہ کر رہی ہیں۔

ارشد ملک کے اس سفرنامے کو اگر میں بھی قارئین کی طرف سے سو بٹا سو نمبر دوں تو قارئین یقیناً اس کی تردید نہیں کریں گے۔ آخری بات یہ کہ اس سفر نامے میں ارشد ملک کی والدہ اور شریکِ حیات کا کردار بھی اہم ہے۔ شریکِ حیات کے اصرار پر وہ حج پر گیا اور والدہ محترمہ کی پسندیدگی کے بعد اس نے اس سفرنامے کو اشاعت کے مرحلے سے گزار کر ہم سب کو اس میں کچھ یوں شریک کیا کہ گویا ہم نے بھی اس کے ساتھ نہ صرف حج کر لیا، حرمین شریفین اور دیگر مقدس مقامات کی زیارت کر لی، بلکہ ان تمام مقامات کی تاریخی حیثیت سے بھی آگاہ ہو گئے۔ چنانچہ ارشد ملک کو مبارک دینا تو بنتا ہے نا۔ مجھے خود بھی زندگی میں حج کی سعادت کئی بار حاصل ہوئی ہے مگر ارشد ملک کا حج نامہ پڑھ کر میں نے جو کیفیاتی اور تصوراتی حج کا روحانی تجربہ گھر بیٹھے کر لیا، میرا یقین کامل ہے کہ اُس کا ثواب اور اجر بھی میرے ساتھ ساتھ ارشد ملک کو بھی پہنچے گا۔

اس حج نامے کا اختتام جس تحریر پر ہوتا ہے اس کا مختصر اقتباس دیئے بغیر شاید میرا یہ اظہاریہ نامکمل رہے گا کہ اس میں ارشد ملک کی حج کے بعد کی کیفیات کا ذکر ایک عجیب مجذوبی انداز میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"(کمیٹی چوک سے نیشنل ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے) میرے راستے میں "بابا شاہ جہان" کا مزار اور وسیع قبرستان بھی آتا ہے جسے میں حج سے پہلے بھی غور سے دیکھا کرتا تھا اور قبروں سے باتیں کیا کرتا تھا، اور حج کے بعد بھی غور سے دیکھا کرتا ہوں اور قبرستان سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھے آج بھی جنت البقیع کی خوشبو یاد آتی ہے۔ میں وہی ارشد ملک ہوں جو وہاں دفن ہو چکا تھا، میں بے شمار قبروں میں اپنی قبر تلاش کر رہا ہوں، مجھے قبرستان سے کوئی مانوس سی آواز آتی ہے۔ یہ آواز کسی روح کی ہے۔۔ شاید میری روح کی"۔

خدائے بزرگ و برتر ارشد ملک کو طویل زندگی دے کہ وہ تخلیقی کائنات میں یونہی مزید زرخیزیاں بھرتا رہے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

خواب زندہ رہتے ہیں ____ عرفان صادق

خواب جس کے سرہانے دھرے تھے

.....

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک ، انتہا یہ ہے

.....

میر تقی میر ایسا فرما گئے ہیں۔ انہوں نے عشق کی آنچ کو دھیما نہیں ہونے دیا تھا۔ خود کو دانستہ اس میں جلا کر خود اذیتی کا لطف لیتے رہے شعر کہتے رہے۔ یہ خود اذیتی شاید شاعر کے خمیر میں شامل ہے۔ یوں جیسے شعر میں طبیعت رواں رہنے کے لیے یہ ضروری امر ہو۔ شاعر کو حقیقت سے فرار ہی اچھا لگتا ہے وہ اپنی طبیعت کی روانی کے لیے کہتا ہے کہ ''خواب زندہ رہتے ہیں'' اور کبھی خواب سرہانے رکھ کر سو جاتا ہے۔ وہ اسی میں طمانیت محسوس کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس کے الفاظ جو اس کے خوابوں کی فہرستیں ہیں وہ انسان کے بعد بھی امر رہتے ہیں اسے زندہ رکھتے ہیں تو یوں اس کے خواب زندہ رہتے ہیں۔

عرفان صادق کا شمار عہد حاضر کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے ان کی غزل میں ٹھہراؤ ہے اور تسلسل بھی ہے۔ ان کے موضوعات جدت و ندرت کا امتزاج ہیں۔ ایک دور تھا جب غزل کو ہی شاعری سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں بہت سے تجربات ہونے لگے تاکہ جمود پیدا نہ ہو جائے۔ غزل اصل میں تو جذبات کا اظہار ہے، محبوب کی مدح سرائی ہے۔ اپنی شدتوں کو سلیقے کے پیرہن پہنا کر شعروں میں ڈھالنا ہے۔ اب یہاں تہذیب وتمدن، سماجی بندشیں اور جس عہد میں شاعر جی رہا ہے اس سے ہم آہنگ بھی ہو۔ تو سونے پہ سہاگہ ہے۔

مذکورہ کتاب عرفان صادق کا پانچواں اردو شعری مجموعہ ہے۔ پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں ایک کتاب ''لوں لوں اچ اڈیک'' منظرِ عام پر آچکی ہے۔ اور ''ابد آباد'' شائع ہو چکی ہے۔

ثمینہ سیّد

وہ حافظ آباد کے قریب قلعہ بلونت سنگھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ایم اے اردو لاہور یعنی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ وہ کم عمری سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ مطالعہ کی عادت نے شعر کہنے کے پیمانے اور سلیقے دونوں کی خوب تربیت کی۔ لاہور آنے کے بعد مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ حلقہ احباب بڑھتا چلا گیا۔ ایک ادبی تنظیم سیوا آرٹس سوسائٹی کے نام سے بنائی اور کتابیں بھی چھاپنے لگے یوں سیوا آرٹس سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے اب تک سینکڑوں کتابیں چھپ چکی ہیں اور تقریبات جن میں زیادہ تر مشاعرے شامل ہیں تسلسل سے معیاری سطح پر ہوتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں:

اگر یہ شعر کی دیوی نہ مہربان ہوتی
تو آتی جاتی ہر اک سانس رائیگاں ہوتی

.....

اسی سے ہم شاعری کے ساتھ ان کی جڑت اور کمٹ منٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار زبان زد عام ہیں۔ وہ ایک مضبوط ادبی ساکھ بنا چکے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ ایک نظم "کہوں کیا" کی صورت میں لکھتے ہیں۔ جس میں شاعر اور اس کے لفظوں کی حرمت کا ذکر ہے، پیڑ، پودوں اور پرندوں کے ہونے سے رونقوں کی بات ہے۔ وہ اس کائنات کے ہزار ہا دکھ اس ایک نظم میں رقم کر چکے ہیں۔ کہ یہ وہ دنیا نہیں رہی جس کی رب تعالیٰ نے انسان کو بشارت دی تھی۔ کہتے ہیں:

بہت خوبصورت سا منظر تھا ان لوریوں میں
عجب جھیل سی نیلگوں نیند تھی
ریشمی خواب اپنے سرہانے دھرے تھے
ہوا خوشبوؤں کو ازائے لیے جا رہی تھی
انہی دلربا منظروں کو تخیل میں باندھے
ساعت میں ان چھپیوں کو سمیٹے
جو عمرِ رواں کی ندی میں بہا تو کھلا راز مجھ پر
کہ میں جس جہاں کو تخیل میں باندھے چلا جا رہا تھا
یہ وہ تو نہیں ہے

.....

غزل اپنے الفاظ، جذبات اور رجحانات کو فنی سانچوں میں ڈھالنے کا نام ہے۔ شاعر ہیئت اور تخیل کی بنیاد پر اپنا اسلوب طے کرتا ہے۔ شعر کہتا رہتا ہے موضوعات میں تنوع آتا جاتا ہے۔ لیکن پیمانوں میں مہارت سے الفاظ جڑنا ہی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ جذبات کو، اپنے گرد و پیش کو، ذاتی اور کائناتی وارداتوں کو کلاسیکیت اور جدت کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی از بر ہو۔ تبھی شاعر کے تخیل کا کینوس وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ کچھ مختلف کیفیات کے اشعار دیکھیے۔

شاخوں پہ در بدر ہوئی پھرتی ہیں تتلیاں
پھولوں سے کون لے گیا خوشبو نچوڑ کے

جیسے میں مبتلا ہوں تذبذب میں اس گھڑی
ڈر ہے کہ اس غزل کی زمیں آخری نہ ہو

پنچھی شجر کی شاخ سے جو کر رہے ہیں کوچ
شاید سمجھ چکے ہیں اشارے زمین کے

دن کہاں، شام کہاں ہوتی ہے، معلوم نہیں
ہر سے ایک ہی دھن ہے تری دلداری کی

جو اک ننھا سا پودا تھا، تناور ہو گیا ہے
مرا بیٹا مرے قد کے برابر ہو گیا ہے

میں بند آنکھوں سے پڑھ سکتا ہوں احساسات اس کے
ترا چہرہ مجھے کچھ اتنا ازبر ہو گیا ہے

.....

عرفان صادق کی شاعری میں محبت، فطری ماحول، سماجی منظر اور پس منظر اپنی پوری شفاف اور حساس صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ چراغ جلا کر منڈیر پہ رکھ دینے کے قائل ہیں۔ انہیں یقین ہے روشنی دریچوں سے دروں تک پھیلتی چلی جائے گی، کائنات میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو روشنی کا راستہ روک سکے:

پاؤں پکڑ لیے تھے مرے، ڈھلتی شام نے
سورج کھڑا تھا جس گھڑی آنکھوں کے سامنے

تیرگی تیز ہو اور ستاروں کا ہجوم
تو بھی ایسے میں کہیں ہو تو دیے جلتے ہیں

.....

ان کے کلام میں زندگی توازن سے گزارنے کی خواہش نظر آتی ہے۔ وہ جذبات و احساسات کو تہذیب کے دائرے میں رکھ کر روایات کی پاسداری کرنا چاہتے ہیں۔ انا اور خودداری پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے۔ شاعر ہونے کے باوجود طبیعت میں وقار انکساری کی نسبت زیادہ ہے۔ جھکتے جھکتے سنبھل جاتے ہیں۔ جو ان کی فطرت کے عملی اور حقیقت پسند ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ شاید انہیں اپنی ذات پر، اپنی صلاحیت پر یا پھر محبت پر کچھ زیادہ ہی یقین ہے:

انا کی اونچی حویلی اسار لی میں نے
جو جنگ جیتی تھی وہ خود ہی ہار لی میں نے

میں جانتا ہوں، انا بھی عزیز ہے اس کو
میں مانتا ہوں، محبت کا اس کو پاس بھی ہے

میں اس کی جھیل سی آنکھوں میں دیکھ بیٹھا ہوں
سبب بھی خوب ہے، مجھ کو غضب کی پیاس بھی ہے

عشق میں کیسے چراغوں کی طرح جلتا ہے دل
جو نہیں کرتا یقیں، وہ دیکھ لے بیشک مجھے

.....

عرفان صادق تخلیق کے تمام تر تقاضوں سے شناسا ہیں۔ وہ شاعری کے اسرار و رموز کو خوب جانتے ہیں۔ اسی لیے شاعری میں طرح طرح کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بحروں میں، کبھی نئی اور تر و تازہ زمینوں کے، کبھی زبان و بیان کے، مختصر یہ کہ وہ شاعری میں تازہ کاری کے قائل نظر آتے ہیں۔ انوکھی تراکیب اور استعارے لاتے ہیں:

جس طرح رات آنکل دیتی ہے خورشید نیا
اس کی باتوں پہ مجھے اتنا یقیں ہوتا ہے

روشنی اوڑھے وہ جب خواب میں آ جاتا ہے
عکس خورشید کا ماہتاب میں آ جاتا ہے

ہم نے ساون کے مہینے کو منانے کے لیے
اپنی آنکھوں کی منڈیروں پہ اتارا ترا غم

گھلنے لگی لہو میں شفق رنگ روشنی
بیٹھے بٹھائے جس گھڑی آیا ترا خیال

وہ اضطراب پر ضبط کرنا جانتے ہیں۔ حقیقت کو خواب بنا کر سرہانے رکھ لیتے ہیں۔ آئینے میں انہیں اپنا چہرہ روشن نظر آتا ہے تو وہ اعتماد سے اپنے چیلنجز سیٹ کر لیتے ہیں، چراغ کو ہوا میں رکھنے سے بھی نہیں ڈرتے۔ تتلی کے بدن سے خوشبو کشید کر کے شعر میں روح پھونکنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اضطرابی کیفیات کو جمالیات کے رنگوں میں رنگ کر خوش رنگ غزل کہتے ہیں۔

ان کے ہاں تصوف کے نمایاں رنگ ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کی سرسبز و شاداب ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے پر لطف پنجابی اشعار اور بولیاں کہتے ہیں۔ جن میں روایت کے روپہلے رنگ جھلکتے ہیں۔ ماحول سے محبت اور جڑت نظر آتی ہے:

لوگوں کا اک ہجوم فلک تک پہنچ گیا
اک آرزوئے خام میں بیٹھا ہوا ہوں میں

.....

تو امرت کا سندیسہ
تیری تو ہے ذات خمار
اس کو کیا تجسیم کروں
سانسیں، پوریں، بات، خمار

.....

تاریخ کا بیان، سیاست کے اثرات، معاشی بدحالی، اقدار کے عروج و زوال اور جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی شکست و ریخت جیسے پختہ موضوعات بھی ان کے شعروں میں ملتے ہیں۔

تو مجھ کو مار یا مر، کنارہ کش ہو جا
مرے حریف مجھے التجا پسند نہیں

شرط اتنی ہے کہ باتوں سے محبت پھوٹے
منصب و خلعت و دستار نہیں دیکھتا میں

ایسے لگتا ہے کہ سب اجسام مٹی ہو گئے
اب صدا آتی نہیں اس قریہء سفاک سے

.....

اداسی، ہجر و فراق اور جدائی کی نوحہ گری بھی ان کی شاعری میں اشتہاری کرتے نظر آتے ہیں۔

تری یادیں ہمارے چار سو ہیں
ہمیں یہ چار دیواری بہت ہے

جو اعتبار بنا ہے، گھٹائیں کیا اس کو
طلب شدید ہے لیکن بتائیں کیا اس کو

.....

شاعر جمالیات کا ترجمان ہے وہ زندگی کی تلخیوں میں بھی گداز ڈھونڈ لیتا ہے۔ عرفان صادق کی شاعری زخموں کی بخیہ گیری کرتی ہے۔ ان کی کچھ غزلیں غنائیت سے بھرپور ہیں۔ سادہ الفاظ میں کیفیات خود بخود گنگنانے لگتی ہیں۔ اشعار آنکھوں کے سامنے مناظر بناتے چلے جاتے ہیں۔ شجر جو بے زبان نظر آتے ہیں وہ ان کے جذبات و احساسات کو بھی شعروں میں ڈھالتے ہیں تو کبھی نظم کرتے ہیں۔ شعر دیکھیے:

میں تھا اداس، پیڑ تھے اور سوگوار شام
پنچھی جو جا رہے تھے مرا گاؤں چھوڑ کر

آنگن سے پیڑ جو کٹا تقسیم کے لیے
مت پوچھ کتنا چڑیوں نے صدمہ اٹھایا ہے

پیڑوں کو اس طرح سے نہ کاٹو، ذرا رکو
لوگو! یہ آخری ہیں سہارے زمین کے

مری باتوں کی پرندے بھی گواہی دیں گے
کتنی بے دردی سے اشجار کا خوں ہوتا ہے

.....

ان اشعار میں جو احساسات ہیں وہ عرفان صادق کے گاؤں سے ان کے خالص ماحول سے انہیں ملے ہیں، بچپن سے ہی ان کے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ شاید وہ کان لگا کر پیڑوں کے دکھ سکھ سنتے تھے۔ اور جس عمر میں نوجوان صرف اپنی ذات سے منسلک خواب دیکھتے تھے تب بھی وہ اشجار، مٹی ہواؤں، چراغ اور گندم کی بالیوں کی خوشبو اپنے اندر اتارتے تھے۔ اداسی بھی شاید اسی ماحول سے مستعار لی ہے جو ان کے اشعار میں مسلسل جاگزیں ہے۔ وہ ظلم و جور اور امیری کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان کے ہاں بہت سے مزاحمتی اشعار ہیں۔ جو ظالم کے خلاف احتجاج ہیں:

اب گریباں کی خیر مانگتا ہوں
ایک وحشت ہے چار سو میرے

اک خوف ہے جو دامنِ دل چھوڑتا نہیں
اک خوف ہے جو لپٹا ہوا ہے یقیں کے ساتھ

مجھے یہ ڈر ہے مرے خواب نہ بکھر جائیں
اگر یہ رات سکوں سے گزار لی میں نے

وہ بے وفا سہی لیکن وفا شناس بھی ہے
اسی لیے تو یہ دل خوش بھی ہے اداس بھی ہے

ضبط کے سارے قرینوں سے شناسا ہوں مگر
اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے رو پڑتا ہوں

اداس رنگوں سے ساری فضا نہائی ہوئی
عجیب کرب سے اس بار آشنائی ہوئی

اک تحیر ہے میرے چاروں طرف
نقش در نقش آئینہ ہوں میں

چلے ہو سامنے لیکن یہ احتیاط رہے
یہ آئینہ ہے یہ چہرہ اچھال دیتا ہے

اک رنگ کے اک نور کے دھارے سے بندھے ہیں
ہم تو تری آنکھوں کے اشارے سے بندھے ہیں

وصل کے خواب سمیٹے یونہی دھیرے دھیرے
سلسلہ آنکھ کا برسات سے جا ملتا ہے

اے مری آنکھ کے پانی میں نہائے ہوئے شخص
تجھ کو معلوم نہیں ضبط کہاں ٹوٹتا ہے

.....

ان کے اردو شعری مجموعے

۱. چاند کی شال میں لپٹے وعدے
۲. رتجگوں کی بارش
۳. میں آنکھیں بھول آیا ہوں
۴. یہی لمحہ محبت ہے
۵. خواب زندہ رہتے ہیں

اور ابد آباد شاعری کے شجر پہ یونہی شادابیاں رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

ن۔م۔راشد کی نظم گوئی: افکار و تصورات کے عیاں اور مخفی پہلوؤں کی بازیافت [بقیہ حصہ]

ایسے ازلی اور ابدی موضوعات جو انسان کا گھیراؤ کیے ہوئے ہیں، ن م راشد کی دلچسپی کا یہ خاص مرکزہ ہیں۔ ایک جانب وہ کلچرل انتھروپولوجی یعنی علم البشریات سے گہرا علاقہ رکھتے ہیں، دوسری جانب مختلف زمانوں کی تمدنی و ثقافتی صورتِ حال، مختلف خطوں میں تہذیب اور کلچر کی عہد بہ عہد جلوہ گری اُن کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد نیا عالمی نظام اور نوسامراجیت جس طرح بروئے کار آئی، راشد چوں کہ اقوامِ متحدہ کے ایک اہم منصب پر براجمان تھے، لہٰذا راشد کو مغرب کے زائیدہ نوسامراجی نظام کو بھی اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ راشد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قدیم سے بھی علاقہ رکھتے ہیں اور جدید کے تو وہ آدمی ہیں ہی۔ وہ اساطیر اور انسانی تاریخ اور انسان کا جو کروڑہا سال پر پھیلا ہوا تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور سماجی سفر ہے، اُس کو بھی ایک اجتماعی انسانی ورثے کے طور پر لیتے ہیں۔ وہ کسی شے کو محض قدامت کی بنیاد پر مسترد نہیں کرتے۔ نئی زندگی کی جبریت اور اُس کا جو تسلط ہے، اُس کو بھی وہ مسترد تو نہیں کرتے، لیکن جا بجا اُس سے بے زاری کا اعلان بہر حال ضرور کرتے ہیں۔ راشد کے ہاں بے زاری اور برأت کی ایک سطح یہ بھی ہے کہ وہ جو سکّہ بند مذہبی تصورات ہیں، اور سکّہ بند جو تہذیبی و ثقافتی تصورات ہیں، وہ اُن کے بارے میں بھی کچھ زیادہ اشتیاق نہیں رکھتے۔ غالباً وہ ایک نئے جہانِ معنی کی تلاش میں ہیں۔ وہ جہانِ معنی جو قدیم علائق سے جُدا ہو اور جس میں نئی زندگی کی جو آلایشیں ہیں، جنھوں نے انسان کی زندگی کو دُوبھر کیا ہوا ہے، اُن سے نجات بھی اُن کے پیشِ نظر ہے۔ یہ ایک طرح کی ''یوٹوپیئن'' سطح بھی بن جاتی ہے کہ جہاں شاعر جو ہے، وہ اپنے تخیل کی بنیاد پر ایک نیا جہانِ معنی اور ایک نیا جہانِ آرزو تشکیل دینا چاہتا ہے۔ خیالی اور تصوراتی سطح کے علاوہ، راشد ایک عملی آدمی بھی تھے۔

راشد وہ شخص نہیں ہے کہ جو اپنے بارے میں کہے کہ رہنے دے گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ وہ گوشۂ قفس کے آدمی نہیں

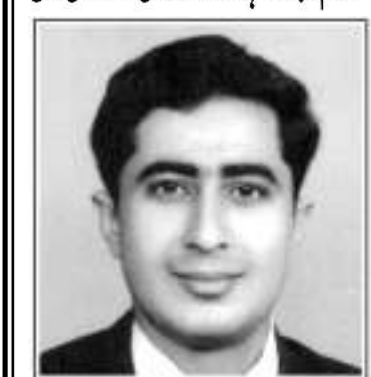

نبیل احمد نبیل

ہیں۔ وہ کھلی آنکھ سے انسان کے قدیم اور جدید کو نہ صرف دیکھتے ہیں، بلکہ اُن کے بارے میں اپنی خاص رائے بھی رکھتے ہیں۔ انسان کے باطن اور انسانیت کے اثبات پر اُن کا یقین کہیں کمزور نہیں پڑتا۔ مگر کئی ایک اعتقادات اور تصورات، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی ہوں یا تہذیبی و ثقافتی ہوں، راشد اُن کے مقلد نظر نہیں آتے۔ وہ جا بجا اُن تصورات کی گرفت بھی کرتے ہیں اور کہیں کہیں اُن پر ہنستے بھی ہیں۔ ایک طرف قدیم کی جھلک اور اساطیر کی جو طلسم کاری ہے، وہ بھی اُنھیں اپنی جانب کھینچتی ہے۔ وہ اپنی تلمیحات، علامات، اپنے استعارات، اپنی تمثالیں، وافر مقدار میں تاریخ، کلچرل انتھروپولوجی اور پُرانے زمانوں اور تہذیبوں سے لے کر آتے ہیں۔

دوسری جانب نئے آدمی کا جو ماجرا ہے، اس کی نئی زندگی کے جو چیلنجز ہیں، سائنس اور ٹیکنولوجی کی تیز رفتاری، صارفیت کا کلچر، نو سامراجیت کے تسلط کے نت نئے ہتھکنڈے، انسان کو زیرِ نگیں رکھنے کے نرالے طریقے اور استحصال کے نئے نئے طریقے ہیں، راشد اُن پر اپنا خون بھی جلاتے ہیں اور اُنھیں اپنی شاعری کا وظیفہ بھی بناتے ہیں۔ معروف معنوں میں راشد نہ ترقی پسند ہیں اور نہ کسی نظریے کے مقلد ہیں۔ وہ ایک ایسے آدمی ہیں، جن کی زمانوں پر نظر ہے۔ وہ موجود سے پوری طرح جُڑے ہوئے ہیں اور موجود کے دباض بھی ہیں۔

ایسے میں راشد کی نظموں میں ہمیں جو منظر نامہ اُستوار ہوتا نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ راشد قدیم کی بہت ساری بوسیدگیوں کو اور بوسیدہ تصورات کو مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیا سیاسی نظام ہو یا معاشی، اُس سے بھی ایک سطح پر وہ برأت اور بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس طرح کی دُنیا کے رونما ہونے کے منتظر اور مشتاق ہیں، جہاں فکر و خیال کی آزادی، انسان کی آزادی، مواقع کی آزادی اور جہاں جواز لی اقدار ہیں، اُن کی پامالی کو روکنے کا کوئی دروبست، کوئی لائحہ عمل اور کوئی طریقہ رائج ہو۔ یہ راشد کے عمومی وظائف ہیں۔ اِس نظم میں یہ نیا آدمی جو ہے، یہ نیا آدمی حقیقی ہے یا یہ نیا آدمی موضوعی ہے! یہ نیا آدمی وہ ہے، جس کی ماجرائیت کو وہ اپنی نظم میں تخلیقی سطح پر سپردِ قلم کر رہے ہیں یا یہ نیا آدمی وہ ہے جو راشد کے تصور و خیال کی پیداوار ہے، جو راشد کی شاخِ تمنا پر نمودار ہو رہا ہے۔

اِس نظم کی خوب صورتی اس نظم کے ''ایسٹریکشن'' میں ہے۔ یہاں پر نیا آدمی بعض صورتوں میں کوئی متعین وجودی پیکر نہیں رکھتا۔ یہ نیا آدمی شاعر کی آرزو کی تشکیل سے پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی آرزومندی ہے کہ قدیم کی بوسیدگی سے اُس کو نجات ملے۔ نئی زندگی اور نئی زندگی کے مظاہر نے انسان کا جس طریقے سے تیا پانچا کیا ہے، اُس سے بھی نجات ملے اور نئے جہانِ معنی اور ایک نئے جہانِ آرزو کی تشکیل ہو۔ اب اس سیاق و

تناظر میں اگر اس نظم کو دیکھا جائے تو اس کے معنی ہمارے لیے سمجھنا اور اس نظم کی تصریح و توضیح اور تعبیر کرنا قدرے آسان ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی نظم کا آغاز ہی اُس نوائے تمنا سے کرتے ہیں، جو شاعر کے بطن کی پیداوار ہے۔ شاعر کے اپنے اُس احساس کی پیداوار ہے، جہاں وہ نئے آدمی کی ماجرائیت کو کھلی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ انسان کا جتنا اب تک کا تہذیبی، ثقافتی اور بشریاتی سفر ہے، اُس کے اُوپر بھی راشد کی نظر ہے۔

یہ سازِ طرب میں نوائے تمنا/ نوائے تمنا پہ کُوچے کے لڑکوں کے پتھر/ یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سُرور(8)

یہ ''کُوچے کے لڑکوں کے پتھر'' کیا ہیں؟ عمومی تصور یہ ہے کہ کوئی نئی بات یا ناپسندیدہ بات کرنے والا یا غیر مقبول بات کرنے والا جو ہے، وہ نشانہ بنتا ہے، گلی کُوچے کے لڑکوں کی تماش بینی اور تماشا گری کا، لیکن بات اتنی سادہ اور معمولی نہیں ہے۔ یہ نوائے تمنا، وہی تمنا ہے جو راشد کے بطن میں پوشیدہ ہے اور جسے اُنھوں نے اِس نظم کا سرنامہ بنایا ہے۔ وہ ایک ایسے جہان کی تشکیل کی آرزومندی میں مبتلا ہیں کہ قدیم کے بوجھ کی گٹھڑی ہے ''ریڈنڈنٹ'' ناکارہ و بے کار ہو گئی ہے۔ وہ گٹھڑی بھی انسان کے کاندھوں کا بوجھ نہ بنے۔ نئی زندگی کی جو سفاکی و ہولناکی اور بے رحمی ہے، اُس سے بھی آدمی کو نجات ملے۔ یہ نجات کے راستے کی تلاش جو ہے، یہی وہ ''نوائے طرب'' ہے اور ''یہ کُوچے کے لڑکوں کے پتھر'' یہ وہ عمومی چلن ہے کہ جہاں ایک نیا تصورِ زندگی لے کر آتے ہیں۔ یہ غیر مقبول ہوتا ہے یا غیر معروف ہوتا ہے تو اُس کو فوری طور پر مسترد کیے جانے کا رویہ جو ہے، وہ ایک انسانی زندگی میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے۔ تو یہ ''کُوچے کے لڑکوں کے پتھر'' اُس ''ریجیکشن کرائسز'' کی طرف اشارہ ہے کہ راشد جس جہانِ نَو کی تعمیر و تشکیل کا خواب دیکھتے ہیں، اُن کے مسترد کیے جانے کا امکان بھی اُتنا ہی ہے۔ استعاراتی زبان میں اُنھوں نے ''نوائے تمنا پہ کُوچے کے لڑکوں کے پتھر'' کُوچے کے لڑکوں کے پتھر مارنے کے پیچھے کوئی مقصدیت نہیں ہوتی اور اُس کے پیچھے کوئی نظریہ بھی کارفرما نہیں ہوتا، لیکن ظاہر ہے کہ وہ پتھر کسی بھی ایسے آدمی کو جو دوسروں سے مختلف ہے یا مختلف راستہ بنانے کی تلاش میں ہے، اُس کے جسم اور روح کو زخمی کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ یہ وہ ''ریجیکشن کرائسز'' ہے، گلی کُوچوں کے پتھر سے جس کی تمثال دی گئی ہے۔ نئے آدمی کو مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ راشد کے نئے آدمی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ارتقائی عمل سے گزر کر ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے۔

اِس ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقم طراز ہیں:

''راشد کی نظموں میں نیا آدمی اپنی پوری قامت کے ساتھ اچانک رونما نہیں ہوتا۔ بہ تدریج اور آہستہ آہستہ اُن کے یہاں نئے آدمی کے اسرار کھلتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں راشد نے اقبال کے مانند نئے آدمی کا تصور پیش نہیں کیا۔ اقبال کا مردِ مومن یا مردِ کامل ایک مثالی شخصیت ہے، جس کے اوصاف پہلے سے متعین ہیں، جب کہ راشد نئے آدمی کو آدمی کے تاریخی اور مادی وجود پر تاملِ پیہم کرتے ہوئے دریافت کرتے ہیں۔" (9)

"پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سُرور" میں یہ "سازِ طرب" کیا ہے؟، یہ سازِ طرب وہ تیقن ہے، جو شاعر کو اپنی تمنا کے برحق ہونے کی بابت ہے۔ وہ قدیم کی بہت ساری بوسیدہ چیزوں کو مسترد کر کے جدید کی بہت ساری چیزیں، جو انسان کی روح اور فکر کو ہلکان کیے دیتی ہیں، اُن سے بھی برأت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس میں ایک نیا آدمی، ایک نئے جہانِ آرزو اور ایک دُنیا کی تشکیل کارفرما ہے۔ یہ آرزومندی خود شاعر کے اندر ایک طرب ناکی پیدا کرتی ہے اور شاعر کی روح کو مسرور کرتی ہے۔ جب راشد کہتے ہیں کہ "یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سُرور" تو پتھر کی بارش تو مسترد کیے جانے کا ایک عمومی رویہ ہے، جو ہر خواب دیکھنے والے کو درپیش ہے۔ سازِ طرب کا سُرور وہ سرشاری ہے، جو کسی نئی آرزو کے اُستوار کرنے سے انسان کی روح میں بیدار ہوتی ہے۔ "نئی آگ دلِ ناتواں کی، یہ سب کا سُرور" میں یہ "نئی آگ" کیا ہے؟ یہ وہی نیا جہانِ آرزو ہے، جس کی تکمیل و تشکیل وہ نظم کے وسیلے سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنا تہذیبی و ثقافتی مدعا اور بشریاتی اِدعا بھی قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

نئی آگ سب سے مقدس ہمیں/ ہم اِس آگ کو کس کی آنکھوں کے معبد/ پہ جا کر چڑھائیں؟/ نئی آگ کے کس کو معنی سمجھائیں؟/ نئی آگ ہر چشم و لب کا سُرور/ نئی آگ سب کا سُرور (10)

اب یہ اشارہ آتش پرستوں کی اُس روایت کی جانب ہے، جہاں آگ کو بھینٹ دینے اور بھینٹ لینے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس روایت کے مطابق آگ کو چڑھاووں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا کہ آگ میں جل کے آدمی پوتر ہو جاتا ہے۔ ان کے ماننے والوں کے خیال میں آگ اتنی طاقت رکھتی ہے کہ ہر چیز کی ناپاکی کو دُور کر دے اور معبدوں کے ضمن میں بھی اشارہ اُنھی آتش پرستوں کی جانب ہے، جو آگ کو چڑھاوے نذر کیا کرتے تھے۔ نئی آگ کے معنی وہی ہیں، جو ہر سوچنے والے، بصیرت رکھنے والے اور حکمت رکھنے والے وژنری آدمی کو معاملہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے سو قدم آگے ہوتا ہے۔ اُس کا عہد اُس کے اندر کی آگ اور اُس کے اندر جو الاؤ اور جوار بھاٹا روشن ہوتا ہے، نئے پن کا، نئی آرزو کا، نئی بصیرت کا اور نئے نور کا، زمانہ اُس کی فوری تفہیم، تحسین اور قبولیت کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ شکوہ میر کو تھا۔ یہ شکوہ غالب اور اقبال کو بھی تھا اور یہی شکوہ عالمی ادب میں دُنیا کے ہر تخلیق کار کو رہا ہے کہ "وہ عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہے" تو یہ "عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ"

کیا ہے؟ یعنی میں ایک ایسے گلشن کی بلبل ہوں، جو گلشن ابھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ نئی آگ کے معنی کسی کو سمجھانے کے پیچھے بھی جو استعجاب ہے، وہ یہ ہے کہ نئی آگ میرے اندر تو روشن ہے، اور مجھے اُس آگ پر یقین بھی ہے، لیکن اِس آگ کے معنی میں سمجھاؤں کس کو؟ وہ اس لیے کہ میرا عصر، میرا عہد اس کو سمجھنے کے لیے اور اس آرزومندی میں میرا ساتھ دینے کے لیے ذہنی و روحانی اور تہذیبی و ثقافتی، وہ ساری سطحوں پر تیار ہی نہیں ہے۔ راشد کی نظموں میں ہمیں اکثر واحد متکلم ملتا ہے، جسے صرف شاعر کی ذات تک محدود کرنا مناسب نہیں۔ صفدر میر کے نزدیک راشد کا واحد متکلم وہ خود نہیں بلکہ اُس کے ڈرامائی کردار ہیں۔(11) پھر چاہے وہ اپنی نظموں میں شکوہ کرتا ہوا نظر آئے یا پھر طنزیہ انداز اپناتا دکھائی دے، ہر دو صورت میں وہ قاری کو ملوث کرتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ وہی شکوہ ہے جو ایک تخلیق کار اور شاعر کا شاعرانہ شکوہ ہے کہ نئی آگ کے معنی کس کو سمجھائیں اور سمجھائیں؟ لیکن کوئی معنی سمجھے یا نہ سمجھے بہرحال یہ آگ بے تاثیر نہیں ہے، اس کا ایک اپنا سُرور ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں:

روایت، جنازہ/ خُدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا/ نالہ کرتا ہوا/ جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے / گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب/ ریاکار لوگوں کو شور و شغف کا سُرور(12)

بظاہر تو یہ لائنیں تہنیت کا ضمیمہ لگتی ہیں یا تہنیت کے احساس پر مبنی محسوس ہوتی ہیں۔ مگر ذرا روایتی سوچ کے انداز سے اور ہماری جو فلسیشنز ہیں، اُن سے ذرا اُوپر اُٹھ کے دیکھیں تو اِس کی تفہیم اور تعبیر کے نئے زاویے ہم پر کُھلتے ہیں۔ وہ یہ کہ کیا یہ وہی خُدا ہے، جو خالقِ کائنات ہے یا یہ وہ خُدا ہے، جس کو انسانوں نے اپنے مفادات نے تراش لیا ہے اور جس کے مختلف ایڈیشن مختلف زمانوں اور مختلف خطوں میں اور مختلف انسانی گروہوں کے درمیان متشکل کیے گئے، جس کے بارے میں مختلف انسانوں کے اپنے اپنے تصورات اور ایڈیشن پائے جاتے ہیں؟ تو غالباً یہاں ''خُدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا نالہ کرتا ہوا'' کے تحت استہزائی لہجے میں ن م راشد نے یہ بات کی ہے کہ وہ جو روایتی تصور خُدا ہے، وہ حقیقی خُدا کے مماثل نہیں ہے۔ روایتی تصورِ خُدا وہ ہے، جسے مختلف زمانوں میں بعض لوگوں نے اپنی سہولت کے لیے تراش خراش لیا ہے۔ نئے دور اور زمانے کی جو لہر ہے، جس میں انکشافات ہیں، سائنس، ٹیکنولوجی اور انسانی انکشافات کا ایک بڑا سیلاب ہے، وہ کلاسیکل خُدا اور روایتی تصورِ خُدا کو ایک رَو میں بہائے لیے جا رہا ہے اور وہ تصورِ خُدا زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جب وہ قائم نہیں رہ سکتا تو نالہ گری اور آہ و زاری کس کے لیے اور پھر یہ کہ اُس خُدا کو تو حاکمیت کا ذوق ہے، اُس خُدا کو تو کبھی کسی چیلنج کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑا، مگر اب سائنس،

ٹیکنولوجی اور کائنات کی دریافت میں آدمی نے جتنی زقندیں اور اُڑانیں بھری ہیں، اُس میں جو خُدا کا کلاسیکل اور روایتی تصور ہے، جسے آدمی نے بسا اوقات اپنی جہالت کے سبب اور بسا اوقات اپنی مفاداتی للک میں جو تصورِ خُدا انسان نے اُستوار کیا، جو حقیقی خُدا سے مختلف ہے اور یہ نیا پن، نیا آدمی اور یہ جو نئی زندگی ہے، یہ اُس تصورِ خُدا کی شکست و ریخت کا پیام لے کر آئی ہے۔ اب بقول شاعر اُس روایتی اور موضوعی خُدا کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے یعنی یہاں حقیقی خُدا اور وہ جو موضوعی خُدا ہے، اُس کے درمیان امتیاز قائم کیے بغیر اس نظم کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔ وہ خُدا جو موضوعی خُدا ہے، اُس خُدا کے پاس کوئی اور چارہ نہیں کہ وہ نالہ زن ہو اور نالہ گری کرے کہ اُس کی مملکت کو، اُس کے تسلط کو اور اُس کے قبضے کو جو انسان کے اذہان پر اور تمدن اور کلچر پر ہے، اُس کو نئے آدمی کے ہاتھوں خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ راشد کے ہاں تجربات کا اظہار عام روایت سے ہٹ کر ملتا ہے۔ وہ سادہ کے بجائے پیچیدہ انداز سے اکثر اپنی نظموں میں ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ یہاں بیک وقت قاری کو اپنی تخلیقی اور تنقیدی سوچ کو بروئے کار لانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اِس ضمن میں وارث علوی رقم طراز ہیں:

"راشد کی شاعری میں جن تجربات کا اظہار ہوا ہے، وہ سیدھے سادے، یک طرفہ اور اکہرے نہیں، بلکہ پیچیدہ ہیں۔ جذبات کی مختلف اور متضاد لہریں ہیں، جو ایک دوسرے میں مدغم ہوتی، اُلجھتی اور بالآخر ایک دھارا ہو کر بہنے لگتی ہیں۔" (13)

ایک سُرور تو وہ ہے، جو شاعر کو نئی آگ اور نئی آرزومندی سے ہے، جو اُس کی روح میں برپا ہے۔ یہاں "شور و شغب کا سُرور" طنزِ ملیح کی ذیل میں ہے۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ جنازے کے ساتھ چلنے والے لوگ جو ہیں، اُنھیں ملال اور دل گرفتگی کی کیفیت میں مبتلا ہونا چاہیے، لیکن اُن میں سے بیش تر لوگ دکھاوا کر رہے ہوتے ہیں اور بیش تر لوگ محض دُنیا داری کی رسم کے طور پر اُس جنازے کا حصہ ہوتے ہیں۔ اُنھیں مرنے والے سے شاید اتنا انسلاک بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ زندگی کی فنا پذیری کے متعلق کچھ گہرا انسلاک اور سوچ بچار رکھتے ہیں یا اُس کی تھوڑی بہت گہری فہم رکھتے ہیں۔ وہ محض روایت کے طور پر اُس جنازے میں شامل یا شریک ہوتے ہیں، جب روایتی طور پر اُس جنازے اور اُس مرنے والے کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا ملال اور قلق جو ہے، اگر وہ اُن کی روح میں سرایت نہیں کیا ہوا اور وہ جنازے میں شریک ہیں تو یہ بہ ذاتِ خود ایک ریاکاری کا عمل ہے۔ ویسے وہ دکھاوے کے لیے آنسو بھی بہائیں گے۔ دھاڑیں بھی ماریں گے۔ راشد دُنیا داری کے اس طرزِ عمل کو ریاکاری سے معنون کرتے ہیں اور مذکورہ ریاکار اپنی ریاکاری میں خوش ہیں۔ وہ ریاکاری اور اداکاری جو اُن کے نالہ و شیون سے پیدا ہوتی ہے، اُنھیں ریاکاری

اور اداکاری کا سُرور ہے اور نئے آدمی کو نئی آگ کا سُرور ہے۔ وہ نئی آگ جس کا مخاطب کوئی نہیں ہے، وہ نئی آگ جس کے معنی میں کسی کو نہیں سمجھا اور سمجھا نہیں پا رہا ہوں کہ زمانہ اُس کی تحسین و تفہیم کے لیے تیار نہیں ہے، تو دوسری جانب سُرور کی ایک اور کیفیت ہے۔ وہ سُرور و کیف جو ریا کار لوگوں کا جنازے میں شرکت کرتے ہوئے ریاکار لوگوں کا نالہ و شیون، ریاکاری و اداکاری کا معاملہ ہے، جس کا کوئی حقیقی تعلق، اُس غم سے اور اُس دُنیا سے اُٹھ جانے والے آدمی سے نہیں ہے۔

نئے آدمی کا نزول/ اور اُس پر غضب کا سُرور/ نئے آدمی اس آمد سے پہلے / مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں/ (زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیے!)/ نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی / اور اُس پر پُرانے، نئے بھیڑیوں کی فغاں/ فغاں کا غضب اور غضب کا سُرور (14)

نئے آدمی کے نزول سے ذرا پہلے کا منظر نامہ ہے، جو روایت اور قدامت کے ساتھ منسلک ہے۔ اب یہاں بھیڑیے، بارش، مہینوں کے بھوکے بھیڑیے، یہ لغوی معنوں سے مختلف ایک منظر نامے کی تمثالیں ہیں۔ یہ تمثالیں کیا ہیں؟ یہ تمثالیں یہ ہیں کہ نیا آدمی اپنے ہمراہ جو ساز و سامان لایا ہے، وہ ساز و سامان اور مال و منال اُن بھیڑیوں کی تشفی کرنے سے قاصر ہے، جنھیں انسانی خون اور گوشت کی چاٹ پڑی ہوئی ہے۔ اُن بھیڑیوں کی جو استحصال اور جبر کے ذریعے اِس دُنیا میں بدصورتی کا موجب ہیں۔ دوسری جانب شاعر اپنی آرزو میں اور اُس آرزو سے جو لفظ اور معنی مرتب ہو رہے ہیں یا ترتیب پا رہے ہیں، اُن کی یک دلی پر نازاں ہے، یعنی اُس میں دُوئی نہیں ہے۔ یہ نئے لفظ و معنی نئے انسان کا جو راشد کا موعودہ انسان ہے، یہ نئے لفظ و معنی راشد کے نئے انسان کا ساز و سامان ہیں۔ یہ اُس کا ساز و رخت ہے کہ پُرانے مفہوم، پُرانے معنی، پُرانی تمثالیں اب کارآمد نہیں ہیں، پُرانی صورت حال اور پرانے عناصر و عوامل اذکار رفتہ ہو گئے ہیں اور نئے آدمی کی جو معنویت، نئے آدمی کا جو ایجنڈا ہے اور نئے آدمی کی جو لغت ہے، اور اُس کی آرزومندی اِن کے درمیان کوئی دُوئی نہیں ہے۔ یہ "یک دلی" ہے یعنی نیا آدمی نئے ساز و رخت کے ساتھ جو ایک ڈسپلن اور جو ایک نئی معنویت لے کر آ رہا ہے، اُس میں تضادات نہیں ہیں، اُس میں دُوئی یا ثنویت نہیں ہے۔ اب یہ جو بھیڑیوں کی تمثال ہے، یہ وہی معاملہ ہے جو اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں (15)

طرزِ کہن دراصل پرانے اور قدیم بھیڑیے ہیں۔ پرانے بھیڑیے افکار و تصورات کے بھی ہیں، پرانے بھیڑیے جو یہ صورتِ حال (سٹیٹس کو) کے بھی ہیں۔ پرانے بھیڑیے اُس نظام کے داعی اور اُس نظام کے وکیل ہیں جو انسان کی

کُلفتوں اور مصائب و مسائل کا سبب ہے اور جو انسان کے استحصال کا بھی سبب ہے۔ ظاہر ہے اگر اُن کی بالا دستی اور اُن کی لُوٹ مار اور لُوٹ کھسوٹ سے نئے آدمی اور نئے آدمی کے ایجنڈے کو اگر ایک چیلنج درپیش ہے تو وہ اُس کا سامنا تو نہیں کر سکتے، وہ اِس لیے کہ اُن کے پاس جو ٹُول ہیں، وہ اذکار رفتہ ہو چکے ہیں۔ نئے آدمی کے پاس پہلے سے بہتر ٹُول، پہلے سے بہتر خیالات، پہلے سے بہتر آئیڈیولوجی، پہلے سے بہتر تصورات اور پہلے سے بہتر زندگی کا ایجنڈا ہے۔ چناں چہ اُن کے پاس سوائے فغاں، رونے دھونے، آہ و زاری کے اور سوائے نوحہ گری کے اُن کے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے، وہ نئے آدمی کا رستہ نہیں روک سکتے اور نیا آدمی جو اپنے ہمراہ تبدیلی کا ایجنڈا لا رہا ہے، اُس کا رستہ پُرانے بھیڑیوں کی آہ و فغاں روک نہیں سکتی، پرانے تصورات کے حامل آدمی کے پاس سوائے آہ و فغاں کے کوئی اور چارہ نہیں۔

نئے آدمی کا ادب/ ادب اور نیا آدمی/ نئے آدمی کو طلب کا سُرور/ نئے آدمی کے گماں بھی یقیں/ گماں جن کا پایاں نہیں/ گمانوں میں دانش/ برہنہ درختوں میں بادِ نسیم/ برہنہ درختوں کے دِل چیرتی / نئے آدمی کا ادب/ اور نئے آدمی کو ادب کا سُرور (16)

اب راشد ایک اور پیچ پر آ گئے ہیں اور وہ پیچ ہے، لفظ و خیال سے جو چیز مرتب ہوتی ہے، انسانی تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ لفظ و خیال کا بہترین استعمال ادب کے ذریعے ریفلیکٹ کرتا ہے، جہاں انسان کی روح، انسان کے مادّی، جذباتی اور احساسی و احساسی مطالبات جو ہیں، وہ ایک ہُنر مندانہ شکل میں متشکل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نئے آدمی کا ادب جو ہے، یہ وہ ادب نہیں ہو سکتا، جو پرانے نظام کا ادب ہے اور پرانے نظام کا زائیدہ ہے۔ یہاں راشد ایک نیا ایجنڈا لے کر آتے ہیں، یعنی جس میں یہ ہے کہ نئے آدمی کا پرانے ادب کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہے۔ نئے آدمی کا پرانے لفظ و معنی، پرانی لغت کے ساتھ، پرانے مفاہیم کے ساتھ، پرانے اور اذکار رفتہ تصورات اور خیالات کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔ نئے آدمی کو نئے ادب کی نہ صرف تلاش ہے، بلکہ اُس کو نیا ادب تخلیق کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اُس کی موعودہ اور اُس کے مجوزہ جہانِ معنی اور جہانِ آرزو کی تکمیل میں اپنا کردار بھی ادا کر سکے اور اُس کی تکمیل میں اُسے بروئے کار بھی لایا جا سکے۔

بات یہ ہے کہ ادب کا بیش تر سروکار خوش گمانی یا بدگمانی پر اپنی بنیادیں اُستوار کرتا ہے اور ادب کچھ ازلی اقدار اور وظائف پر یقین تو رکھتا ہے، لیکن بیش تر وہم و گماں، خوش گمانی اور بدگمانی پر اساس کرتا ہے۔ ادب اس طرح قطعیت کے ساتھ، انسان کی تہذیب نہیں کرتا، جس طرح مذاہب ایک نوع کی قطعیت مسلط کرتے ہیں۔ ادب اُس قطعیت کا داعی و علم بردار نہیں ہوتا۔ ادب ایک سطح پر دراصل

خیال اور گمان کے دُھند لکے میں سفر کرتا ہے۔ اِسی باعث ادب کی ایک سے زیادہ تعبیرات و تصریحات اور تفہیمات ممکن ہیں، جس طرح مذاہب میں مذاہب کی ایک سے زیادہ تشریحات و توضیحات ممکن نہیں۔ مذاہب تو اپنے تصورات میں قطعیت پر یقین رکھتے ہیں اور قطعیت پر زور دیتے ہیں اور اُن سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ ادب میں انحراف اور استرداد دونوں ممکن ہیں۔ نیا آدمی جب بروئے کار آئے گا اور نیا آدمی جب طلوع ہو رہا ہے تو نیا آدمی اپنے ساتھ نیا لغت لے کر آئے گا، نیا فلسفۂ زیست لے کر آئے گا۔ نئے لغت اور نئے خیالات سے نیا ادب پیدا ہوگا۔ نئے آدمی کو اُس نئے ادب کا سُرور جو ہے، وہ نئے آدمی کو مہمیز کرے گا۔ اُس کو متحرک رکھے گا اور اُس کو اپنی موعودہ اور مجوزہ دُنیا میں لے جائے گا، جو وہ پیدا کرنے کا آرزومند ہے۔

درختوں کی برہنگی وہی ہے، جو ہمیں خزاں کی صورت میں نظر آتی ہے؟ غالباً یہ معاملہ اس سے زیادہ گہرا ہے۔ یہ سامنے کے درختوں کا منظر ہے اور اُس میں جو "بادِ نسیم" ہے، یہ بھی وہی ہے۔ درخت تو یہاں تمثال کے طور پر آئے ہیں اور بادِ نسیم کا استعمال بھی ایک استعارے کے طور پر ہوا ہے۔ مقصد اِن مصرعوں اور لائنوں کا یہ ہے کہ زندگی کا جو پرانا سیاق و سباق ہے، زندگی کا پرانا پیرہن جو ہے، اُس نے آدمی کو بے چہرہ ہی نہیں کیا بلکہ بے لباس بھی کر دیا ہے۔ اب آدمی کو ایک نئے لباس کی ضرورت ہے اور ایک نئی بادِ نسیم کی ضرورت ہے۔ وہ نئے آدمی کے تہذیبی و ثقافتی، ذہنی اور روحانی مطالبات کی نہ صرف کفالت کر سکے بلکہ اُس کے تازہ تر تقاضوں کو بھی پورا کر سکے، جن کی نئے آدمی کو تلاش و جستجو ہے۔ "نیا آدمی" راشد کی ایک نہایت اہم نظم ہے۔ اس نظم کے ذریعے راشد کے بہت سارے تہذیبی و ثقافتی، عمرانی، سیاسی، معاشی تصورات کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ کئی ایک لحاظ سے راشد کی مذکورہ نظم بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نظم محض جہانِ آرزو کی بشارت دیتی ہوئی نظم نہیں ہے، بلکہ یہ نظم شاعر کے عالمی تناظر کی ایک نمایندہ ترین نظم ہے۔ راشد کے یہاں جبر و قدر کا موضوع بھی ایک بڑے موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جبر و قدر کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر عہد کی اپنی جبریت ہوتی ہے۔ راشد موجودہ دُنیا میں ایک نئی دُنیا دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اُن کی نظموں میں صوت اور معنی کے مابین ایک منفرد قسم کا آہنگ پایا جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک راشد کی شاعری اس وقت شعر الصوت اور شعر المعنی کی کشاکش کا نمونہ ہے۔ یعنی اُن کے یہاں نظم بیک وقت دو سطحوں پر کام کرتی ہے، جنھیں آسانی کے لیے صوت اور معنی کی سطحیں کہا جا سکتا ہے۔ (17) وہ اُس نئی دُنیا کی تشکیل و تعمیر اپنے خیالات کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ پھر اُن کے ذریعے جن کی وہ ذہنی و روحانی اور اخلاقی تربیت اپنے تصورات اور خیالات کے ذریعے کر رہے تھے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے اپنے قاری

کو اُس جاریہ صورت حال سے بغاوت پر اُکسا رہے ہیں، جس نے ذہن و فکر کو اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر دور کا ایک اپنا نصاب ہوتا ہے اور ہر دور کے اپنے وظائف بھی ہوتے ہیں۔ راشد اپنے دور کے حسابوں نئی فکر اور نئے آدمی کی آرزومندی پر ایقان رکھتے تھے۔

راشد نئے تصورات کی پرداخت اور تبدیلی کے آرزومند اور ایک نئے سماج کی تشکیل کے خواہاں تھے۔ ہر بڑا آدمی، ہر نیا آدمی، وہ صرف ادب کا ہی نہیں، شاعر ہی نہیں، وہ فلسفے کا بڑا آدمی بھی ہو سکتا ہے، وہ سائنس دان بھی ہو سکتا ہے، وہ زندگی کے کسی اور شعبے کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ ہر نیا آدمی اپنے خواب اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے، اور اِس سے قطع نظر کہ اُس کے خوابوں کو تعبیر ملتی ہے یا نہیں ملتی۔ خوابوں سے عاری آدمی تقریباً حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے، وہ جو وژنری ہوتا ہے، اُس کو قدرت نے یہ صلاحیت عطا کی ہوتی ہے کہ وہ دُھند کے پار دیکھ سکتا ہے یا دیکھنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی دُھند کے پار لے جانے کی صلاحیت سے متصف ہوتا ہے۔ مادّی سطح پر اگرچہ راشد نے اپنے عہد کے مناصب سے استفادہ کیا، لیکن اس کے باوجود راشد اپنی ذہنی و فکری سطح پر اپنے ذہنی مطالبات کی دُنیا کے تخلیق کار ہیں اور نئے آدمی اور نئی زندگی کے تقاضوں سے صرف نظر کے قائل بالکل بھی نہیں ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

(1) راشد، ن م - ماورا - لاہور: مکتبہ اُردو، 1941ء - 75-76

(2) میر، تقی میر - کلیاتِ میر (مرتبہ: احمد محفوظ) - نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، 2013ء - 46-

(3) راشد، ن م - ماورا - محولۂ بالا - 76-

(4) فیض، احمد فیض - ن م راشد - مشمولہ راوی - لاہور: گورنمنٹ کالج - جنوری - فروری 1939ء - 28-

(5) راشد، ن م - ماورا - محولۂ بالا - 76-77

(6) احمد، سلیم - نئی نظم اور پورا آدمی - کراچی: ادبی اکیڈمی، 1962ء - 39

(7) نوری، محمد فخر الحق - مطالعۂ راشد (چند نئے زاویے) - فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2016ء - 191-

(8) راشد، ن م - کلیاتِ راشد - لاہور: ماورا پبلشرز، 1990ء - 513-

(9) نیر، ناصر عباس - راشد کا نیا آدمی - مشمولہ بنیاد - لاہور: لمز، شمارہ 1، 2010ء - 241

(10) راشد، ن م - کلیاتِ راشد - محولہ بالا - 514-

(11) میر، صفدر - راشد کی "ماورا" کی نئی دریافت - مشمولہ نقدِ راشد - لاہور: شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، 2010ء - 49

(12) راشد، ن م - کلیاتِ راشد - محولۂ بالا- 514-

(13) علوی، وارث- حرف و معنی کے آہنگ کی تلاش ("ماورا" سے "لا=انسان" تک)- مشمولہ ن م راشد: فکر و فن (مرتبہ: شہریار/مغنی تبسم) - حیدر آباد: مکتبۂ شعر و حکمت، 1971ء- 62

(14) راشد، ن م - کلیاتِ راشد - محولۂ بالا- 515-

(15) اقبال، محمد - کلیاتِ اقبال - لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1992ء- 87

(16) راشد، ن م - کلیاتِ راشد - محولۂ بالا- 515-

(17) فاروقی، شمس الرحمٰن -ن م راشد: صوت و معنی کی کشاکش- مشمولہ ن م راشد: شخصیت اور فن (مرتبہ: شہریار/مغنی تبسم) - نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء

مآخذ

آفتاب احمد-ن م راشد: شخص اور شاعر- لاہور: ماورا پبلشرز، -1989

جمیل جالبی -ن م راشد: ایک مطالعہ (مرتبہ)- کراچی: مکتبۂ اُسلوب، 1986ء

سعادت سعید- راشد اور ثقافتی مغائرت- لاہور: شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، 2010ء

سعادت سعید -نقدِ راشد (مرتبہ) - لاہور: شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، 2010ء

سلیم احمد- نئی نظم اور پورا آدمی- کراچی: ادبی اکیڈمی، 1962ء

شہریار/مغنی تبسم-ن م راشد: شخصیت اور فن (مرتبہ) - نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 1981ء

شہریار/مغنی تبسم-ن م راشد: فکر و فن (مرتبہ)- حیدر آباد: مکتبۂ شعر و حکمت، 1971ء

ضیاء الحسن/محمد فخر الحق نوری-ن م راشد- اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2010ء-

محمد حمید شاہد - راشد، میراجی، فیض - فیصل آباد: مثال پبلشرز 2014ء

محمد فخر الحق نوری - مطالعہ راشد (چند نئے زاویے) - فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2016ء

ن م راشد- ایران میں اجنبی- لاہور: گوشۂ ادب 1955ء

ن م راشد - کلیاتِ راشد - لاہور: ماورا پبلشرز، 1990ء

ن م راشد - گماں کا ممکن - لاہور: نیا ادارہ، 1976ء

ن م راشد - لا=انسان - لاہور: المثال، 1969ء-

ن م راشد- ماورا- لاہور: مکتبۂ اُردو، 1941ء

ن م راشد - مقالاتِ ن م راشد - اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، 2002ء

☆☆☆☆☆

شاعری کا دفاع

Sir Philip Sidney

ترجمہ: گل اکبر خان

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور قابل قدر ایڈورڈ واٹن بادشاہ کے دربار میں ملازمت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ ایک روز ہم دونوں نے جان پیٹرو پوگلیانو کے محکمہ شہسواری میں گھڑ سواری سیکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے اصطبل میں ویسے بھی سائیس کی ایک عدد آسامی خالی پڑی تھی۔ ہمارا ارادہ جان کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا اس لئے اسے یہ ڈر تھا کہ مبادا ہم اپنا ارادہ بدل دیں تو جلد ہی اپنی اطالوی ذہانت سے کام لے کر گھوڑوں اور گھڑ سواری سے متعلق اپنے تجربات ہمارے ساتھ شیئر کرنے لگا۔ ایک طرف وہ گھوڑوں اور شہسواری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا تو دوسری طرف غصے سے میرے نتھنے پھول رہے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق:

''انسانوں میں سب سے معزز انسان ایک فوجی ہوتا ہے اور فوجیوں میں سب سے معزز انسان ایک شہسوار ہوتا ہے۔ جنگ کے ماہر اور امن کے یہ محافظ استقامت کا پہاڑ بن کر بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں اس لئے اپنی قوم میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ روئے زمین پر ایسا کوئی شہزادہ نہیں ملے گا جو ایک بہترین گھڑ سوار نہ ہو۔ پوری دنیا میں گھوڑے کا ہم پلہ دوسرا کوئی جانور نہیں۔ یہ نہ صرف وفادار، خوب صورت اور بہادر جانور ہے بلکہ اپنے مالک کی خدمت میں ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔''

پوگلیانو گو کہ ایک مشفق انسان تھا مگر گھوڑوں اور شہسواری سے متعلق اس کے مذکورہ دلائل نہایت ضعیف تھے جو نا قابل اطمینان ہیں۔ لیکن میں اپنی بابت بتادوں کہ نجانے وہ کون سا لمحہ تھا جب مجھے ایک ''شاعر'' کا خطاب ملا۔ اس لئے میں مجبور ہوں کہ شاعری کا دفاع کروں جسے میں اپنی تمام تر نیک نیتی کے ساتھ سرانجام دوں۔ تو آپ پر لازم ہے کہ میری اس کاوش کو سراہیں اور اس کی ستائش کریں کیونکہ اس دانا کی بخشش ضرور کی جاتی ہے جو اپنے استاد کے نقش قدم پر چلے۔

دیگر علوم وفنون کے دانشور اپنے علم وفن کا دفاع کرنا اپنا استحقاق سمجھتے ہیں اسی مصداق میں بھی بطور شاعر، شاعری کا دفاع کرنا اپنا استحقاق سمجھتا ہوں۔ کچھ دانشور خاصے ناشکرے واقع ہیں جو شاعری کی مخالفت میں دن رات لگے رہتے ہیں

اور اسے بدنام کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ شاعری تو جہالت کی تاریکیوں میں علم کی روشنی ہے۔ اس کی مثال اس دایہ کی ہے جو اپنے دودھ کے ذریعے دیگر علوم وفنون کو طاقت بخشتی ہے۔ جبکہ شاعری کے مخالفین کی مثال اس خار پشت (سیہہ) کی ہے جو تالاب پہنچتے ہی اپنے ہی میزبان کو بھگا دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی مثال وائپر (viper) نامی سانپ کی ہے جس کی پیدائش پر اس کی ماں مر جاتی ہے۔

یونان کی قدیم تاریخ میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین اور فلاسفہ مثلاً ماسیس، ہومر، ہیسوئیڈ، اورفیوز اور لائی نس اعلیٰ پائے کے شاعر تھے جن کی قدامت مسلم ہے۔ یہ وہی دانا ہیں جو علم وفن میں اولیت کے درجے پر فائز ہیں جو آنے والی تمام نسلوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہیں یہاں تک کہ غیر مہذب دنیا کے لوگ بھی ان کے علم وفن کے قدر دان تھے۔

نام ور شاعر امفیون سے متعلق تاریخ شاہد ہے کہ ان کی شاعری میں کمال درجے کا سحر پوشیدہ تھا جسے سن کر قومی سے قوی چٹانیں اپنی اپنی جگہوں سے سرک جاتی تھیں۔ (Thabes) تھیبز کا مشہور محل اسی طرح تعمیر کیا تھا۔ اور لیوز نے اپنی شاعری کے ذریعے پتھر دل رکھنے والے وحشیوں کو آہنی شاعری اور علم وہنر سے آراستہ کیا۔

رومیوں میں لیوس اینڈرونیکس اور ای نیوس جیسے علم وفن کے دانشور دراصل شعرا ہی تھے۔ اطالوی زبان کے علمی خزانے کو بھرنے والے مثلاً دنتے، پیٹرارک اور بوکیشیو اعلیٰ درجے کے شعرا تھے۔ ہماری زبان میں گاور اور چاسر جیسے نامور شعرا نے علم وفن کے خزینے بھر دیئے جن پر انگریز قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یونان کے فلسفی فطری طور سے اعلیٰ درجے کے شعرا تھے۔ تھیلز، ایمپی ڈوکلس اور پارمینڈس جیسے اعلیٰ پائے کے فلسفیوں نے اپنا اپنا فلسفہ شعر وشاعری کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ فیثا غورث اور فوسیلیڈس کے فلسفوں پر بھی شاعری کا رنگ غالب ہے۔ ٹائرٹائس کے جنگی قوانین ہوں یا سولن کی پالیسی سازی ہو، ہر دو شعری فطرت میں رنگے ہوئے ہیں۔ عقلمند سولن ایک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے جنہوں نے بحر اوقیانوس کی کہانی شعری رنگ میں پیش کیا جس پر بعد میں افلاطون نے اپنی فکری بنیادیں اٹھائیں۔ افلاطون خود بھی اپنے دامن کو شعری فطرت سے بچا نہ پائے۔ ایتھنز کی اکثریت ان کی شاگرد رہی ہے۔ اگر اس نے کسی کو تعلیم دینے کے بجائے اسے کسی طاقچے میں رکھا ہوتا تو آج اس کا اتنا بڑا نام علم و فن کی دنیا میں زندہ نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنے علم و فن میں شعری فطرت کی خوب عکاسی کی ہے۔ یونان میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے ہوں یا کسی دعوت و ضیافت کے اصول یا گیگیز کی انگوٹھی (Gyges Ring) جیسی کہانی ہو، ان سب میں شعری فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یہ سب اپالو کے باغ کے مختلف پھول ہیں۔

مورخین نے بھی اپنی اپنی تاریخیں شعری فطرت کے تاثر سے مرتب کی ہیں۔ ہیروڈوٹس نے

اپنے تاریخی فن پارے کی ابتدا نو میوزوں (Nine Muses) سے کی ہے جس کی تقلید میں بعد میں آنے والے تمام تر مورخین نے یہی اسلوب تحریر اپنایا حتی کہ تواریخ میں بادشاہوں اور جنگ کے سپہ سالاروں کی زبانی لمبی لمبی تقاریر اور خطابات میں بھی شعری فطرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس لئے یہ اعلیٰ درجے کے شعرا کہلائے۔

ترکی میں شریعت پاک کی تعلیم دینے والے فقہاء کرام کی اکثریت شاعروں پر مشتمل تھی۔ اپنے ہمسایہ آئرلینڈ کی مثال لیجئے علم کی کمی کے باوجود شاعروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کے ہاں بھی نام ور شعرا پائے جاتے ہیں۔ اپنے روایتی ناچ کے ساتھ وہ جو گیت گاتے ہیں اسے آریتوس (Aretos) کہا جاتا ہے جس میں وہ اپنے دیوتاؤں اور سورماؤں کے گن گایا کرتے ہیں۔ ویلز میں قدیم انگریز شاعر کو بارڈ (Bard) کہتے ہیں۔ رومن، سیکسن، ڈینس اور نارمن حملہ آوروں نے جہاں علم کے عام وسیلے ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی تو یہ شعرا ہی تھے جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ان علوم کو از سر نو مرتب کیا۔ رومی شاعر کو ویٹس (Vates) کہتے ہیں۔ لاطینی زبان کے اس لفظ کا مطلب پیشین گوئی کے ہیں۔

ورجل کی شاعری سے لوگ فال نکال کے اپنی قسمت اور مستقبل کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ زمانہ قدیم میں مختلف بادشاہوں سے متعلق کافی شواہد ملتے ہیں کہ وہ نام ور شعرا تھے مثلاً قدیم برطانیہ کے گورنر البینس (Albinus) بچپن سے شعر کہتے تھے اس کا ایک مشہور شعر ملاحظہ ہو:

Arma amens eapio,
Nec sat rationis armis

ترجمہ: مجھے غصہ آتا ہے اسلحہ اٹھالیتا ہوں پھر سوچتا ہوں کہ دلیل اسلحہ اٹھانے میں تو ہرگز نہیں۔۔۔

لفظ Charm دراصل لفظ Carmina سے اخذ کیا گیا ہے اور اس زمانے میں یہ لفظ بطور تعظیم صاحبان عقل و خرد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ڈیلفوس (Delphos) اور سیبلا (Sibylla) دو غیبی مخلوقات شعرا پر شعر الہام کرنے پر مامور تھیں۔ یہاں لفظ ویٹس (vates) نہایت معقولیت رکھتا ہے۔ داود کا زبور بھی شعری الہامات سے معمور ہے اور اس بات کی شہادت قدیم و جدید دور کے محققین بھی دے رہے ہیں کہ زبور میں مندرج الہامی پیغامات دراصل شعری اسلوب میں نازل ہوئے ہیں اور یہ وہ الہامی گیت ہیں جو یونان کے بے موسیقی کے آلات کی مدد سے گائے جاتے تھے۔ جب کبھی بھی داود زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے تو سننے والوں پہ عجیب سی رقت طاری ہو جاتی تھی اور وہ ایسا محسوس کرتے تھے جیسے خدا اپنی شان کبریائی کے ساتھ آسمان سے زمین پر نزول فرما رہے ہوں۔ چرندے پرندے حمد و ثنا میں آپ

کے ساتھ شامل ہو جاتے تو قریبی پہاڑ بھی وجد میں آ جاتے۔

یونان کے لوگ شاعر کو تخلیق کار کہا کرتے۔ یہ لفظ قدیم یونانی زبان کے لفظ (Poiein) سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب تخلیق کار کے بنتے ہیں۔ اور یہ وہ تخلیق ہے جو پہلے سے وجود نہ رکھے۔ ہماری انگریزی میں تخلیق کو make To جبکہ تخلیق کار کو Maker کہا جاتا ہے۔ المختصر شاعری ایک تخلیقی عمل ہے جو کسی تخلیق کار کے ہاتھوں وجود پاتا ہے۔۔۔

ماہرین فلکیات کا کام کائنات کے اسرار و رموز کی جانکاری ہے۔ مورخین کا کام زمانہ رفتہ پر گہری نظر ڈالنا ہے۔ زبان کے جملہ قواعد و بناوٹ، فقروں کی ترکیب نحوی ماہرین صرف و نحو کا کام ہے۔ انسان کے اندر جنم لانے والی بیماریوں کی تشخیص اور علاج ایک ماہر طبیب کا کام ہے تو تجریدی تصورات کی روشنی میں مافوق الفطرت اشیاء کے ساتھ تعلق کسی ماہر مابعد الطبیعیات کا ہے مگر شاعران تمام حدود و قیود سے آزاد اور مبرا ہوتا ہے وہ ایک الگ نوعیت کی فطرت لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتا ہے اس کے پاس انفرادیت ہوتی ہے جس کی دنیا تخلیقی صلاحیتوں سے معمور اور حقیقی دنیا سے الگ تھلگ اور منفرد دنیا ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف اس کے سامنے حقیقی اشیاء ہوتی ہیں تو دوسری طرف سائیکلوپس (Cyclopes) چیمراس (Chimeras) اور فیوریز (Furies) بھی ان کی شاعری میں موجود ہوتی ہیں۔

حقیقی زندگی میں خواہ پیڑ پودے ہوں یا بہتے ہوئے دریا یا خوشبودار پھول ہوں یہ سب اتنے خوبصورت اور حسین و جمیل نظر نہیں آتے جتنا ایک شاعر انہیں اپنے تخیل کی مدد سے حسین و جمیل بنا کے شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شاعر پیتل سے بنی اشیاء کو شعری تخیل سے سونا بنا دیتے ہیں۔

تیاگنس (Theognes) جیسا سچا عاشق، پیلیڈس (Pylades) جیسا سچا دوست، اور لینڈو فیوریاسو (Orlando Furiosi) جیسا سورما، زینوفون کا سائرس (Xenophone ' s Cyrus) اور ورجل کا اینیئز (Virgil's Aneas) یہ تمام کہانیاں شعری فطرت میں رنگے ہم تک پہنچی ہوئی ہیں جو اپنے پڑھنے والوں پر ایک خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں جنھیں پڑھ کے ہر قاری اپنے زعم میں آپ سائرس سمجھنے لگتا ہے یوں تخیلی اثر سے ذہیر سارے سائرس پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

خدا سب سے بڑا خالق ہے جس نے شاعر کو اپنی صفت سے متصف کیا ہے اور خلق کی ملکہ سے نوازا ہے۔ انسان خدا کی پہلی فطرت ہے جبکہ کائنات دوسری۔ دنیا کا سب سے غیر معمولی واقعہ وہ تھا جب آدم نے خدا کے حکم سے جنت سے ہبوط کر لیا۔

ارسطو نے شاعری کی بہت ہی موزون

تعریف کی ہے اور میمز (Mimes's) یعنی ''نقل'' کی اصطلاح وضع کی جو استعاراتی طور پر بولنے والی تصویر سمجھی جاتی ہے۔ شاعری کا مقصد اپنے پڑھنے والوں نہ صرف تعلیم دینا ہوتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ انہیں خوشی، مسرت اور حظ بھی عطا کرتی ہے۔

شاعروں کی تین قسمیں ہیں۔

1: مذہبی شعرا
2: فلسفی شعرا
3: حقیقی شعرا

1: مذہبی شعرا:۔

مذہبی شعرا نے شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں جیسے داود کا زبور اور سلیمان کے گیتوں کا گیت وغیرہ۔ بائبل اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ واعظین نے اپنے وعظ ونصیحت اور امثال شعری رنگ میں پیش کئے ہیں۔ موسیٰ و دیبورا (Deborah) کی عہد نامہ قدیم میں شعری فن کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ عمانویل ٹریمیلکس (Emanual Tremelius) اور فرانسیسکس جولیس (Fransiscus Julius) نے عہد نامہ قدیم کے تیسرے حصے میں ''کتاب ایوب''، ''زبور''، ''امثال''، ''واعظ'' اور ''سلیمان کے گیت'' شامل کیے ہیں۔ ایک معزز فرشتے نے عہد نامہ قدیم میں موجود شعر و شاعری کی یہ کتابیں نازل کی ہیں۔ ہومر نے اپنے دونوں کلاسیکی نظموں ایلیڈ اور اوڈیسی کی ابتدا چند حمدوں سے کی ہے۔ اسی طرح اورفیوز اور امفیون نے بھی اپنی اپنی نظموں کی ابتدا حمدوں سے کی ہے۔ ولی جیمز (Saint James) ہمیشہ دل کو لبھانے لگانے کی خاطر اپنی کونسل میں زبور کو خوش الحانی سے بآواز بلند پڑھا کرتا تھا۔

2: فلسفی شعرا:۔

اخلاقی تعلیم دینے والے فلاسفہ جیسے ٹائرٹائیس (Tyrtaes)، فوسی لیڈس (Phicylides) اور کیٹو (Cato) بہترین شعرا تھے۔ فطرت پسند شعرا جیسے لوکریشیس (Lucretius) جنھوں نے جیورگکس (Georgics) لکھے ایک اچھے شاعر تھے۔ اگر ماہرین فلکیات میں سے مینیلس (Manelus) اور پونٹانس (Pontanus) قابل قدر شعرا تھے تو مورخین میں لوکن (Locan) قابل قدر شاعر گزرے ہیں۔ فلاسفہ سے متعلق فیصلہ ادیب کریں گے کہ آیا انہیں شعرا شعار کی فہرست میں جگہ دی جاسکتی ہے یا نہیں۔

3: حقیقی شعرا:۔

تیسرا گروہ ان حقیقی شعرا کا ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو نہ صرف تعلیم دیتے ہیں بلکہ انہیں شادمانی، مسرت اور حظ سے بھی ہمکنار کر دیتے ہیں۔ فلسفی اور شاعر میں خصوصی فرق یہ ہے کہ فلسفی تصویر ساز ہوتا ہے جو اشیاء کی ظاہری خدوخال کو دیکھتا ہے جبکہ فکر کی گہرائی

سے عاری ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس شاعر کے پاس گہری فکر ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ ایسی تصویر کشی کر لیتا ہے کہ مجرد اشیاء بھی حقیقی روپ دھار لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوکریشیاء نامی شہزادی کی موت پر شعرا نے شاہکار کلام پیش کیے جبکہ مورخین اس کی موت کو تاریخی تناظر میں دیکھا کرتے ہیں۔

شاعری کی قسمیں اور اہمیت کے لحاظ سے ان کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

(1) رزمیہ شاعری (2) گیت (3) المیہ شاعری (4) طربیہ شاعری (5) طنزیہ شاعری (6) قافیہ بند شاعری (7) مرثیہ (8) لوک گیت وغیرہ

قافیہ بندی شعر و شاعری کے لئے لازمی جزو نہیں اس کے باوجود بعض شعرا نے ردیف و قافیہ کا بہت لحاظ رکھا ہے۔ کیونکہ یہ شاعری کا زیور کہلاتا ہے اور اس کی بدولت موضوع بآسانی بیان کیا جا سکتا ہے۔ مگر بعض شعرا مثلاً زینوفون نے اپنی شاعری میں قافیہ بندی کا لحاظ بالکل بھی کیا ہے جنھوں نے عظیم سائرس کے کردار کی خوب ستائش کی ہے جو شعری نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ سیسرو (Cicero) نے اپنے بھائی کوئنٹس (Quintus) کو جو خط لکھا تھا وہ شعری نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہیلوڈورس (Helodorus) کی محبت کی لکھی داستان تیاگنز اور چاریکلیہ (Theognes and Chariclea)

بھی شعری نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ صرف قافیہ بندی سے کوئی بندہ شاعر نہیں کہلاتا۔ اگر کوئی عام بندہ وکیلوں کا لمبا چوغہ پہنے تو وہ وکیل نہیں کہلائے گا۔

شاعر کو چاہیے کہ وہ نیکی اور بدی کی ایسی تصویر کشی کرے اور اسے تعلیم کے انداز میں اپنی شاعری کا محور بنائے۔۔

موضوع کے اعتبار سے بھی شعرا نے اسلوب بیان کے فنکارانہ تجربات سے کام لیا ہے چونکہ شاعری دیگر علوم و فنون کی بہ نسبت اعلیٰ و ارفع حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کا اسلوب بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہئے۔ جبھی تو شعرا خوب ناپ تول کر بہترین الفاظ کا چناؤ کیا کرتے ہیں اور اس کی آرائش و زیبائش کا بھرپور اہتمام کرتے ہیں اس لئے بعض شعرا قافیہ بندی کو شاعری کا لباس سمجھتے ہیں۔

حقیقی شاعری صحیح طور سے اپنا کردار خوب نبھاتے ہیں کیونکہ اس کی مدد سے انسان کو "عقل خالص" اور "بصیرت" ملتی ہے۔ یہ تکبر، غرور، کبر و نخوت اور ترش روئی ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جبکہ پڑھنے والوں کو سیکھنے کے بھرپور مواقع مہیا کرتی ہے اور اس سے شخصیت کی تکمیلیت میں مدد ملتی ہے۔

شاعری انسان کو اس کے فطری رجحانات مختلف تاثرات کے زیر اثر کسی مخصوص ہدف کی طرف لے جا کر رہنمائی دیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

محمود درویش کا وطن ۔۔۔ فلسطین لہولہو

آج ایک بار پھر فلسطین لہولہو ہے۔ غزہ کی پٹی پر قیامت برپا ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بے گناہ فلسطینی بچے، خواتین اور بوڑھے شہید ہو رہے ہیں۔ ایسے دل دہلا دینے والے مناظر تو شاید فلسطینیوں نے بھی پہلے نہ دیکھے ہوں۔ پورے پورے خاندان شہید ہو رہے ہیں۔ اسرائیل نے درندگی کی انتہا کرتے ہوئے ہسپتال پر بھی بم برسا دیئے۔ حالانکہ عالمی قوانین کے مطابق بدترین حالات میں بھی عبادت گاہوں، ہسپتالوں، ایمبولینسز اور تعلیمی اداروں پر بمباری نہیں کی جاتی۔ مگر شاید ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں کچھ انسانیت باقی ہو۔ جب انسان درندہ بن جائے تو پھر کون سا قانون اور کہاں کا قانون۔ ہسپتال پر بمباری کے بعد اسرائیل کہہ رہا ہے کہ یہ حملہ اس نے نہیں کیا۔ اب وہ پروپیگنڈا کے ذریعے اپنی درندگی کو چھپانے کی کوشش کرے گا۔ ان حالات میں فلسطینی شاعر محمود درویش یاد آرہے ہیں۔ جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے وطن پر ہونے والے مظالم کو اجاگر کیا اور اپنے ہم وطنوں کی تکالیف کو ساری دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ فلسطین کی آزادی کا خواب اس عظیم شاعر کو قبر میں بھی چین کی نیند سونے نہیں دے گا۔

محمود درویش ابھی صرف 6 برس کے تھے کہ جب 1948ء میں اسرائیلی فوج نے ان کے آبائی گاؤں ''بروہ'' اور 416 دوسرے دیہات پر قبضہ کرلیا۔ لوگوں کو بے دخل کرنے کے لیے دہشت گردی کی گئی۔ قتل وغارت سے بچنے کے لیے وہ اور ان کا خاندان لبنان چلے گئے۔ محمود درویش بتاتے ہیں کہ انہوں نے پہلی بار آٹھویں کلاس میں مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ایک نظم پڑھی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اسرائیلی طالب علموں کو زندگی کی ہر چیز کا مزہ حاصل ہے۔ جبکہ اس کے پاس گھر ہے نہ کھلونے۔ نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ جس سے وہ دنیا کے لطف اٹھا سکے، جو اسرائیلی بچوں کو حاصل ہیں۔ اس نظم میں ایک فلسطینی لڑکا ایک اسرائیلی لڑکے سے سوال کرتا نظر آتا ہے:

تمہارے پاس گھر ہے
میرے پاس گھر کیوں نہیں ہے؟
تم جیسے چاہو کھیل سکتے ہو
سورج کے نیچے کھیل سکتے ہو
میں کیوں نہیں؟
خوشیاں تمہارے لیے ہیں
میرے لیے کیوں نہیں؟
میں ایک پناہ گزین کیوں ہوں؟
تم اور میں اکٹھے مل کر کھیل کیوں نہیں سکتے؟

.....

رانا محمد شاہد

یہ نظم پڑھنے کے بعد اگلے ہی روز اسے فوجی دفتر میں بلا لیا گیا اور دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے آئندہ کوئی ایسی نظم لکھی یا پڑھی تو اس کے والد کو پتھروں کی کان کے کام پر لگا دیا جائے گا اور اس کے خاندان کے لیے روٹی کا حصول بھی مشکل ہو جائے گا۔

جوانی کے ایام میں محمود درویش کو ریٹا نامی ایک اسرائیلی دوشیزہ سے محبت ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ریٹا دوسرے مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے محبت کی۔ دونوں کی محبت میں مذہبی تنازعات بھی حائل نہ ہوئے۔ محمود درویش نے ریٹا کی محبت میں بہت سی غزلیں اور نظمیں بھی کہیں۔ 1967 کی عرب اسرائیل جنگ، خصوصاً مصر کی شکست کے بعد ادیبوں و دانشوروں نے محسوس کیا کہ احساس شکست سے بہتر موت ہے۔ محمود درویش کے ساتھ دوسرے بڑے دانشوروں کو بھی اس تلخی سے گزرنا پڑا۔ عظیم عربی شاعر نزار قبانی کو جب بیروت اور گولان کے علاقے میں اسرائیل کے داخلے کی خبر ملی تو یہ ان کے لیے سوہان روح کے مصداق تھا۔ انہوں نے بستر مرض پر کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ کر اس تکلیف دہ صورتحال پر پورا ایک دیوان لکھ ڈالا۔ انہی حالات میں جب محمود درویش اور ریٹا کے تعلقات خراب ہوئے تو ریٹا نے اپنے عقیدے اور نظریے کی خدمت کے لیے اسرائیلی فوج میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اب محمود درویش کے لیے بھی اس تعلق کو برقرار رکھنا ناممکن ہو گیا اور اس نے بھی اپنے وطن کی محبت کو اس محبت پر ترجیح دینے کی ٹھان لی۔ ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں جب اس حوالے سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔ ''میں اس لڑکی سے کیسے محبت کر سکتا ہوں۔ جو نابلس اور القدس میں میرے ملک کی لڑکیوں کو گرفتار کرتی ہے''۔ پھر کہا ''ریٹا اور میری آنکھوں کے درمیان رائفل حائل ہو گئی ہے''۔ محمود درویش جب اس اسرائیلی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا تو اس نے اسے لکھا۔ ''میں اپنے قبیلے کے شرف و مجد اور اس کی اونچی ناک کے باوجود، اپنے شہر اور رسوم و عادات کے باوجود تمہیں چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ جب میں ان تمام چیزوں کو تج دوں گا اور (تمہاری خاطر) ان کو فروخت کر ڈالوں گا تو تم مجھے بیچ ڈالو گی۔ چنانچہ میرے ہاتھ سوائے خسارے کے کچھ نہیں آئے گا'' اور جب محمود درویش کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ دشمن فوج کی سیکرٹ سروس ایجنٹ ہے تو اس نے لکھا ''مجھے یوں لگا گویا کہ میرا وطن دوبارہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا ہے''۔ اس کے بعد اس نے اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ بھی کیا کہ ''ریٹا! ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے اہمیت کا حامل نہ ہو، لیکن یہ میرا دل تھا''۔

فلسطینی مزاحمتی شاعری کا سب سے مضبوط حوالہ محمود درویش کو کہا جاتا ہے۔ نظمیں ان کی خاص پہچان بنیں۔ انہوں نے فلسطین کا قومی ترانہ لکھا۔ ان کی شاعری میں اپنے وطن یعنی فلسطین کا غم اور اس کی محبت کا اظہار یہ جا بجا ملتا ہے۔ ان کے تقریباً 30 شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان تمام کتابوں میں مقبوضہ فلسطین کے کرب اور اس کے باسیوں کے احساسات و جذبات نمایاں ہیں۔ ان کی نظموں میں بے وطنی اور دربدری جا بجا ملتی ہے۔ ان کے نمایاں مجموعوں

میں ہال و پر پرندے، زیتون کے پتے، انجام شب، بندوق کی روشنی میں لکھنا، دور کی خزاں میں اترنے والی ہلکی بارش، گلی میں پرندے مر رہے ہیں، اجنبیوں کا بستر اور وہ ایک جنت تھی شامل ہیں۔ حماس کے حالیہ ''طوفان الاقصیٰ'' آپریشن کے ردعمل میں اسرائیل نے فلسطینیوں پہ عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ روزانہ بے گناہ بچے وخواتین شہید ہو رہے ہیں اور ہزاروں شہید ہو چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر جو مریضوں کا علاج کر رہا تھا، اچانک ہسپتال میں اس کے باپ اور بھائی کی لاشیں لائی گئیں تو خود پر قابو نہ رکھ سکا اور سسکیاں لیکر روتا رہا۔ زخموں سے چور ننھے ننھے بچوں کو اٹھائے فلسطینی ہسپتال کی طرف بھاگ رہے ہیں کہ شاید ان میں زندگی کی رمق باقی ہو۔ کل ایک ویڈیو میں دیکھا کہ ایک بے بس باپ اپنے ملیامیٹ ہوئے گھر کے اوپر کھڑا بڑے بڑے پتھروں کے سوراخوں سے اپنے بچے کو آوازیں دے رہا تھا مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ شاید وہاں زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ایک ماں دکھ کی کیفیت میں ادھر ادھر بھاگتی ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کچھ یوں کرتی ہے۔ ''میرے دونوں بچے شہید ہو گئے۔ انہوں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا''۔ آہ۔۔۔۔ اس ماں کا دکھ کہ میرے بچوں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اور وہ اسی بھوک میں اس دنیا سے چلے گئے۔ ایک ماں کی یہ حالت بھی عالمی ضمیر کو نہ جگا سکی۔ فلسطین کے مظلوم عام شہریوں پر دن رات بمباری جاری ہے۔ ایک معصوم بچہ اپنے مکان کے ملبے پر کھڑا روتے ہوئے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ''میری امی ابو اور بھائی کو مار دیا گیا۔ کوئی ہے جو ہماری مدد کو آئے''۔ اس کی پکار پتھر دل کو بھی پاش پاش کر دے مگر مسلم دنیا کے حکمران بے حسی کا کمبل اوڑھ کر سو رہے ہیں۔ ایک معصوم بچی زخموں سے چور ہے، مگر اسے زخموں کی کوئی پروا نہیں۔ وہ اونچی آواز سے روتے ہوئے چلا رہی ہے ''میری ماما کدھر ہے۔۔۔ میری ماما''۔ ڈاکٹرز اسے سینے سے لگائے دلاسہ دیتے ہیں۔ مگر اس کی پکار کی شدت کم نہیں ہو رہی شاید اس لیے کہ اسے دلاسہ ماں کے سینے سے ہی آئے گا اور ماں دائمی جدائی دے چکی ہے۔ مائیں اپنے معصوم بچوں کی لاشیں اٹھائے پکار رہی ہیں کہ ''کہاں ہیں عرب اور مسلم حکمران۔ دیکھ نہیں رہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''۔ شاید یہی سب کچھ دیکھ کر محمود درویش عام فلسطینیوں کا سوچتا ہے۔ عام لوگ جو اصل میں جنگ کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

جنگ ختم ہو جائے گی
قائدین مصافحہ کریں گے
اور رہ جائے گی وہ بوڑھی ماں جو اپنے شہید بیٹے کی منتظر ہو گی
وہ بیوی جو اپنے شوہر کی راہ تک رہی ہو گی
اور وہ بچے جو اپنے بہادر باپ کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں گے
معلوم نہیں ہمارا وطن کس نے بیچا
لیکن۔۔۔ میں نے دیکھا کہ قیمت کس نے چکائی

.....

محمود درویش کی ایک طویل اور مشہور نظم "شناختی کارڈ" پر اسرائیل کی پارلیمنٹ میں بحث ہوئی تھی۔ اس نظم میں انہوں نے فلسطینیوں کے جذبات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب ظلم ایک حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس کا ردعمل خطرناک ہوتا ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

لکھ لو
میں ایک عرب ہوں اور تم نے
میرے اجداد کے باغات چرا لیے ہیں
اور وہ زمین بھی جہاں
میں اپنے بچوں کے ہمراہ کاشت کاری کیا کرتا تھا
تم نے ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا ہے
سوائے ان پتھروں کے
تو کیا تمہاری حکومت
جیسا کہ کہا گیا ہے
ان پتھروں کو بھی چھین لے گی؟
لہٰذا لکھ لو
صفحہ اول پر سب سے اوپر
میں لوگوں سے نفرت نہیں کرتا
نہ تجاوزات قائم کرتا ہوں
لیکن
جب مجھے بھوک لگے گی
تو غاصب کا کچا گوشت چبا جاؤں گا
خبردار رہو
خبردار رہو
میری بھوک سے
اور میرے غصے سے

.....

اس میں محمود درویش نے اپنی مٹی اور اس کے رہنے والوں کا دکھ بیان کیا ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ ہونے والا یہ ظلم کوئی نیا نہیں حالات جب قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو دنیا کو پتا چلتا ہے۔ ورنہ فلسطینیوں کی شہادتیں تو روزانہ ہوتی ہیں۔ محمود درویش نے کہا تھا:

دو سے آٹھ شہیدوں
اور دس زخمیوں
بیس گھروں
اور پچاس زیتون کے پیڑوں کا
قتل عام ہمارا روزانہ کا نقصان ہے

.....

آخر میں محمود درویش کی کچھ نظمیں، جن میں وہ اپنے وطن کا دکھ اور درد بیان کرتے نظر آتے ہیں:

میرا وطن نہ تو حکایات اور کہانیوں کا بنڈل ہے
اور نہ ہی صرف یاد
یہ زمین میری ہڈی کی جلد ہے
اور دل
اس کی گھاس پر شہد کی مکھی کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے

"ایک فلسطینی لڑکی"

اس کی آنکھ فلسطینی ہے
اس کا نام فلسطینی ہے
اس کا لباس فلسطینی ہے
اس کا جسم اور اس کے پاؤں اور اس کا درد فلسطینی ہے
اس کے لفظ فلسطینی ہیں
اس کا لہجہ اس کی صوت فلسطینی ہے
اس کی حیات فلسطینی ہے
اس کی موت فلسطینی ہے

☆☆☆☆☆

موتیوں کی مالا: حیرتوں کا ہالہ

شاعر کی شاعری اس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے جب آپ اس کو بحیثیت دوست یا بطور ہم سایہ یا دوست کے جانتے ہوں، اگر ایسا نہیں اور آپ کی ایک ملاقات ہو جائے تو بھی ایک شناسائی کا رشتہ اس کی شاعری سے بھی بن جاتا ہے گویہ کیسا ہی غیر سائنسی حوالہ ہو لیکن شاعری کی اٹھک اور بیٹھک کی الگ سی تفہیم ہونے لگتی ہے۔ میں شفیق انجم کو نہیں جانتا تھا۔ بس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب ''موتیوں کی مالا'' ان کے دستخط سے ملی۔ جس کے سرورق پر لکھا تھا ''نظمیہ کہانیاں''۔ اس ترکیب نے تجسس کو ابھارا اور کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ جونہی کتاب کے پہلے صفحے سے موتیوں کی مالا کے نظروں نے مس کیا تو ساتھ ہی شفیق انجم کی پتلی پتلی ماس سے گریزاں انگلیوں میں پکڑے قلم سے پھوٹتے لفظوں اور ان لفظوں کی مالا نے لمحہ بھر رکنے کا اشارہ کیا---- اور شفیق انجم کی آنکھیں میری نظروں کے سامنے پھر گئیں جو اس ماہر نباض نے عینکوں کے پیچھے چھپا رکھی ہیں:

ایک ہی دن میں قصہ تمام نہیں ہوتا
ستاروں کی راکھ ہونے میں
کچھ وقت لگتا ہے
کہانی قسط وار چلتی ہے
زندگی اور موت حکمِ کن سہی مگر
وقت لگتا ہے
رفتہ رفتہ نمو کے آثار ابھرتے ہیں
انتہائی سانچوں میں ڈھلتے
معدوم ہونے کی سمت بڑھتے ہیں
---- فناک لڑی ہے
موتیوں کی مالا بننے
صراحی دار گردنوں میں سجنے
داد پانے
اور ٹوٹ بکھرنے میں
وقت لگتا ہے

.....

شفیق انجم کا قلم، اس کا ذہن، اس کا خیال، اس کا مشاہدہ، اس کا تجربہ، اس کا نفسِ جبریل اور اس کا تیقن سبھی ان چند سطروں میں عیاں ہو جاتا اور وہ اپنے قاری

عادل سعید قریشی

کو ذہنی طور تیار کر لیتا ہے کہ وہ کیسے اپنے قاری کو اپنی شاعری سے لطف دے گا، پھر اس کتاب ''موتیوں کی مالا'' کے لطف نے یوں اپنے پڑھنے والے کو جکڑ لیتا ہے کہ اس کا موتیوں کی مالا سے ایک انس اور ایک رشتے کے بن جانے پر یہ آواز کانوں میں پڑی ''آؤ زندگی کو دیکھتے ہیں'' پھر قاری کی شفقتی کائنات کی سیر شروع ہوتی ہے۔

''موتیوں کی مالا'' کی یہ کتاب نظمیہ کہانیاں نہیں بلکہ مجھے تو یہ ایک ہی نظمیہ کہانی معلوم ہوئی ہے جو بظاہر الگ الگ عنوانات میں بٹی ہوئی، ایک مالا میں پروئی ہوئی ہیں۔ ''موتیوں کی مالا'' ایک نوحہ ہے ٹوٹتی روایات کا، یہ مرثیہ ہے نئی بنتی اقدار کے کھوکھلے پن کا، یہ ماتم ہے فرد کے فرد سے خوف کا، اعلان ہے بھیڑ میں تنہائی کا، نفسا نفسی کا، احتجاج ہے جدیدیت کی دوڑ میں انسانیت کے قربان کر دینے کا، حوصلہ ہے کیکٹس کے دیس میں ایک پرکاہ کی ہریالی کا، ضمانت ہے منافرت و غم کے کھلیان میں حب اور پرسہ کی بوائی کی۔۔ بیسویں صدی میں، اکیسویں صدی سے کئی خوف وابستہ تھے، جب نئی صدی شروع ہوئی تو پہلے ہی دو عشروں نے انسان کی پیش بندی اور ڈر کو سچ بھی ثابت کر دیا ہے۔ فرد نے فرد کو، معاشرے نے معاشرے کو، سماج نے سماج کو ایک ایسے مکڑے کی جالے سے لپیٹ لیا ہے جہاں سب کچھ ہے سوائے انسان دوستی کے، لحاظ داری اور ہم دردی کے۔ بین الاقوامی دیہہ میں اعلیٰ انسانی اقدار ختم ہو چکی ہیں، نفع خوری کا چلن ہے خواہ معاملہ جذبوں کا ہو یا احساسات کی بات ہو انسان نے سب کاروبار بنا دیا ہے۔ دنیا خوف اور ڈر کی مترادف بن چکی ہے:

نظم

عجب سمسیا میں ہوں
عجب سمسیا میں ہوں
کہ شہروں شہروں دہاڑے
رات ٹوٹ پڑی ہے
اور سناٹوں کی بکل میں لپٹے
گلی کوچوں میں
دہشت رینگ رہی ہے
اور موت سیٹیاں بجاتی ہوئی
دروازہ دروازہ رکتی
---- آوازے لگاتی ہے
---- باہر نکلو
لوگ باہر نکلتے اور مارے جاتے ہیں
اور جو نہیں نکلتے
وہ اپنے اپنے گھروں میں بند
شیروں کی طرح دھاڑتے
بے بسی میں پیچ و تاب کھاتے
ہر گزرتے لمحے
گیدڑ بنتے جا رہے ہیں ----

.....

شفیق انسانوں کے دکھوں پر کڑھ رہا ہے، وہ انسانیت کی ذہنی اور شکمی افلاس پر افسردہ خاطر ہے، وہ دیکھے اور ان دیکھے دکھوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، وہ کسی ایسی راہ کی، کسی ایسی وادی کی تلاش میں ہے جہاں انسان اور انسانیت دکھ والم سے نجات پا کر سکھ اور مسرت کے ساتھ زندگی جیے اور وہ خود بدھا کے سنگھاسن پر بیٹھے۔ اس کا ذہنِ رسا اس دنیا کے بدرنگیوں کو تتلی کے پروں کے رنگوں سے بدلنے کا خیال رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک بڑی نعمت جانتا ہے، وہ زندگی کو ہنگامہ اور رونق نہیں مانتا بلکہ موت سے ملی مہلت جانتا ہے، شفیق انجم اپنے سوالوں کے جوابوں کے لیے خود اپنے دل کو مرشد مانتا ہے:

یہ اذیت کیا ہوتی ہے مرشد؟
جب لگڑ بگڑ تمہارا راستہ روکنے لگیں
یہ لگڑ بگڑ کب راستہ روکتے ہیں مرشد؟
جب تمہارے بہت سے دوست ہوں
لیکن کوئی دوست نہ ہو----

حالی نے بھی تو کہا تھا:

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یہاں تھوڑے ہیں بھائی بہت

.....

شفیق انجم کی نظم اسی ایک موضوع کو لیے ساری کتاب میں ہے، یعنی ساری نظمیہ کہانیاں ایک معنوی شیرازہ سے بندھی ہیں، یک موضوعیت نہیں کہی جا سکتی لیکن موضوع میں گہرائی کے سبب زندگی کی رنگا رنگی ان نظموں میں داد کی متقاضی ضرور ہے، زندگی خود ایک فرد کا تنہا تجربہ ہوتے ہوئے بھی تجربے کی وسعت کی حامل ہے اسی طرح شفیق انجم کی یہ کہانیاں بھی زندگی کی طرح بہت سے زاویے اور رنگ کی عکاس ہیں، وہ سے دردوں کی امین، بہت سی خاموشیوں کی صدائیں ہیں۔ ''موتیوں کی مالا'' کا بالاستعیاب مطالعہ اپنے قاری کو بتاتا ہے کہ شفیق انجم ایک پختہ مشاہدہ رکھنے والا، عمیق تجربے کا حامل، معروضی اندازِ فکر کا مالک ہے نیز اس کی یہ نظمیہ کہانیاں اس کے تخیل کی ارفعیت، پیش کش کی جدت، وقیع ڈکشن، وسیع کینوس کا پتا بھی دیتی ہیں:

کوئی بات نہیں رفیقِ محترم
تم پارسائی کی انتہائی منزل پر ہو
اور میں ریتکتے ریتکتے
پہلی سیڑھی کے قریب پہنچا ہوں

.....

اس کی شاعری ہمیں اسی معاشرہ کا عکس دکھاتی ہے جس میں آپ، میں اور وہ خود بھی سانس لے رہا ہے وہ ایک ہی معاشرہ ہے جہاں حساس اور رقیق القلب فرد کی کوئی گنجائش نہیں، ہر فرد خود اپنی نظروں میں پارسا اور معصوم ہے لیکن دوسروں کو خائن، بے ایمان اور بدعنوان دیکھتا ہے۔ شفیق انجم یہاں بڑی سہولت سے اس حقیقت کو بیان کر کے گزر جاتا ہے کیوں کہ

یہ سوچنے کا انداز بلکہ طرزِ عمل ہمارے معاشرے میں کم از کم عام سی چیز ہے، ہر شخص دوسروں کو کم تر اور خود کو برتر جانتا ہے، یہ معاشرتی بیماری جو ہوئی۔ ایسی کئی معاشرتی بیماریاں، کجیاں اور ٹیڑھی سوچیں شفیق کے ہاں مذکور ہیں:

اسی طرح
چھوڑیے صاحب
محبت وغیرہ کچھ نہیں
سب حساب کتاب کے معاملے ہیں
لین دین ہوتا ہے
حسن کا، جنس کا، پیسے کا
روٹی کپڑے کا
زندگی کے لش چہرے کا
اپنے اپنے معاملے ہیں
لین دین میں
تولہ، ماشہ اوپر نیچے کر کے دیکھیے
محبت کا تھوپڑا
لال پیلا ہو جائے گا
قوسِ قزح میں اتنے رنگ نہیں
جتنے محبت کے نام پر مکر ہیں
چھوڑیے صاحب ------

.....

کیا یہ آج کے عہدِ ستم ظریف کا المیہ نہیں ہے؟ ہے بالکل ہے کہ یہ آج کے عہد سے ملنے والا درد و کرب ہی ہے جو ''موتیوں کی مالا'' کی پوری واحد کہانی کا محیطوی ہے۔ جھوٹے پن اور بونوں کی بات، حریری لمس تاپنا اور اپنے کنویں میں رہنے کا اعلان، باسی پانیوں کی بساند، ضرورتوں کی گٹھڑیوں کا ذکر، پچھلی صف کے آدمی کا قصیدہ کہنا، آپ نے دیکھے ہوں گے؟ نہیں؟ چلیں بے حس، بہرے اور بولتے گونگوں سے تو زندگی کی راہوں پر ملے ہی ہوں گے:

کتنے بودے ہیں ہم
بے حس، بہرے -- اندھے لوگ
کام پڑنے پر، جی اٹھتے ہیں
رنگ برنگے بھیس بدل کر
پوجا پاٹ میں جت جاتے ہیں
چڑھتے سورج کو سجدے کرتے ہیں
رستہ رستہ رل جاتے ہیں
بجھ جاتے ہیں
کام پڑنے پر
شوخ سجیلے بانکے ہم
اندھا دھند محبت کرتے
رات کی رات مرشد گھڑتے ہیں ----

.....

کیا یہ آپ کا اور میرا تجربہ نہیں؟ کیا ایسے بودے، کوتاہ قد اور چھوٹی سوچ کے لوگ آپ کی میری زندگی میں موجود نہیں؟ شفیق کائنات میں یہی لوگ اور موضوعات ہیں جن سے وہ موتیوں کی مالا پروتا ہے، وہ اس مکروہ چہرہ اور چھوٹی سوچ کے لوگوں کے سینوں سے پھوٹتے تعفن کی بو سے انسان کو بچانے کے لیے یہ موتیوں کی مالا تیار کرتا ہے:

دل کی بالکونی میں بیٹھا منظر

شرق و غرب تک پھیلی ہوئی
کسی افسردہ سی کہانی کا حصہ ہے
کہانی کہ جس میں بے قرار آنکھیں ہیں
ہونٹ ہیں، لمس ہے
اور ہاتھوں میں ڈالے ہاتھ
بے خوف چلتے سائے ہیں ----
دل کی بالکونی میں بیٹھا منظر
معلوم نہیں
منظر میں، بالکونی میں ---
یہ افسردگی سی کیا ہے
تنہائی سی کیا ہے
---رات اتنی چپ چاپ سی کیوں ہے؟

.....

''موتیوں کی مالا'' ایک نظمیہ کہانی ہے یہ میرا ماننا ہے، اسی بیانیے کے ساتھ میں حاضر ہوا تھا--- لیکن جب میں صفحہ 87 اور 88 اور ''عورت ہونا آسان نہیں'' پر پہنچا تو لمحہ بھر ٹھٹکا کہ یہ تو الگ سا کچھ پڑھنے کو مل رہا ہے لیکن جب کتاب کو مکمل پڑھ لیا تو جانا کہ یہ تو اس نظمیہ مجموعے کے سرنامے ہیں۔ کہانی کا حسن یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی منشا سے پیش کراتی ہے، یہ ایک طویل داستان تھی جس میں دو خانے ایسے ہیں جن کا بظاہر کوئی رشتہ یا تعلق دکھتا نہیں لیکن معنوی اعتبار سے ایک ہی کُل ہے، ایک ہی نامیاتی کل جس کی سب کَل سیدھی ہیں۔ اسی طرح اس کہانی کا ایک کلیدی حصہ ''تم بھی مت آنا'' ہے۔ یوں کہوں کہ یہ پارٹ ایسے ہی ہے جیسے کسی موتیوں کی تسبیح کا ''امام'' ہو:

برائے نام سہی
پہلے کچھ تعلق سا تھا
کبھی کوئی یاد سی آجاتی تھی
کوئی عکس سا لہرا جاتا تھا
کچھ سائے سے جمع ہوتے
صورت و نقش بناتے
کچھ واہمے سے گھیر کر کے
لمس تخلیق کرتے تھے
سانسیں بولنے لگتی ہیں
میٹھے لفظ بنتے تھے
تسلی دیتے تھے
تھکن اترتی جاتی تھی
زندگی ہری بھری ہو جاتی تھی (جاری)

.....

نظم کے اس کے اس حصے کے علاوہ ساری ''موتیوں کی مالا'' میں دکھ، غم انگیزی، یاسیت، لاچاری اور انسانی مجبوری کا بیان ہے۔ یہاں محبت اور لمس، زندگی کے باقی ہونے کا پتا ملتا ہے لیکن موہوم سا، مٹتا ابھرتا--- لیکن اس پارٹ سے ساری کہانی میں ایک روسی بھی دوڑ جاتی ہے، اس کے بعد والا حصہ میں سبک سری سی محسوس ہوتی ہے، خیال میں الگ سا پاکپن ملنے لگتا ہے گو کہ اگلا حصہ ''موت کی گتھی سلجھتی نہیں'' کے عنوان سے ہے اور اس حصہ میں جو تیقن کی لو ابھرتی ہے پھر وہ عجیب سمیا تک گاڑھی

ہوتی جاتی ہے۔
بحث سمیٹنے کی شے نہ ہوتی تو میری بحث اب اس کتاب کی اسلوبیاتی کے تجزیے سمت بڑھنے لگتی، اس کتاب میں شاعر نے صوتیات، لفظیات، معنیات اور نحویات کے باب میں بھی خوب تجربے کیے ہیں اور قاری اس کے اسلوبیات حوالے سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا اس حوالے بات چیت ادھار رہی۔ اب بحث کو انجام دیے دیتا ہوں اور شاعرِ خوش خیال اپنے بارے میں جو یہ کہہ رہا ہے میں بھی اس کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں:

میں تو ایسا ہی ہوں
کڑوا، کسیلا، تیکھا، تند
تم مجھے بدلنے کی کوشش میں
اپنا وقت ضائع مت کرو
کہیں دائیں بائیں نکل جاو
دیکھو کیسی کیسی اچھی مورتیں
خدا نے بنا رکھی ہیں
اور کیسے کیسے اچھے مزاجوں سے
انہیں مالا مال کر دیا ہے----
اے خدا!
میں آج کانپ کے رہ گیا
سانس کی ڈوری سے بندھے
احوال کی حقیقت سی کھل گئی ہے
یونہی نیند میں چلتے چلتے
آنکھ سی کھل گئی ہے

.....

شفیق انجم کی کتاب ''موتیوں کی مالا'' ایک خوش فکر اور زندگی کو نہایت معروضیت سے دیکھنے والے شاعر کی کتاب ہے جس میں کڑواہٹ ہے تو مٹھاس مائل، درد ہے تو مسرت انگیز، یاسیت ہے تو آس سمیت، درد کا واویلا ہے تو تمکنت کے ساتھ، گلہ مندی ہے تو عالی ہمتی سے لپٹی، رونا ہے تو ضبط کا، اشک شوئی ہے تو انسان کی کم ہمتی پر، بشارت ہے تو نئے صبح کی - - - - شفیق انجم کی موتیوں کی مالا اس کے دل کا ایک ایسا راز ہے کہ جس کو اس نے اس دنیا کی نئی تشکیل اور مثالی صورت کے آشکار کیا ہے۔

زندگی گزار رہا ہوں
جیسے زندگی مجھے گزار رہی ہے
اُتنے جتنے کام کرتا ہوں
بھوک لگتی ہے
تو کچھ کھا لیتا ہوں
کچھ پی لیتا ہوں
نیند آتی ہے تو سو جاتا ہوں
مجھ سے الجھنے کی ضرورت نہیں
کوئی جواب نہیں ملے گا
مجھے تمہاری اچھل کود سے
کوئی دل چسپی نہیں
جاؤ بھیا اپنا کام کرو
میری زندگی میں
تم ہو ہی نہیں!

☆☆☆☆☆

ظفر اقبال ظفر کی زندگی بھر کے مشاہدات واحساسات کا اظہار

سرگزشت ''ظفریات''

ظفر اقبال ظفر سے رفاقت پر مجھے فخر ہے جو لم وبیش ایک دہائی پر محیط ہے، میں ان کی قلمی فن اور شخصیت کا ہمیشہ سے معترف ہی نہیں بلکہ مداح بھی ہوں۔ خوش اخلاق، دھیمہ لب ولہجہ، نرم گفتار اور شرافت و تہذیب کے مجسم ظفر اقبال ظفر ایک ملنسار و درویش منش شخصیت کے مالک ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی ذوقِ مطالعگی ہم مزاج ہوئی جس نے انہیں قلم کاری کی جانب راغب کیا اور یوں موصوف آج صاحبِ اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاہکار کتاب ''ظفریات'' کی صورت میں صاحب کتاب بھی ہوگئے ہیں، ''ظفریات'' کسی شاعر کے اِس مصرعے کے مصداق ہے کہ ''رقصاں ہے لفظ لفظ میں اِک موجِ زندگی''۔ آپ کی تحریروں میں فقرات مختصر مگر مضمون جامع ہیں، تمام علمی، دینی، معاشرتی اور سماجی موضوعات پر مصنف نے ہر پہلو کو جذبات واحساسات کو بیدار کر کے منطقیانہ استدلال کے ساتھ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر سپردِ قرطاس کیا ہے۔ مصنف کی بناوٹ اور تکلفات سے پاک، خلوص وسچائی سے لبریز زندگی کی سادگیاں اُن کی عام فہم تحریروں میں بھی نمایاں ہیں اور کچھ کر گزرنے کا عزم کچھ کر دکھانے کا ولولہ بھی پوشیدہ نہیں۔ مضامین مبالغہ آرائیوں سے کوسوں دور احساسِ آدمیت اور دردِ دل ہی نہیں بلکہ ادب کی آمیزش کے ساتھ دل نشین انداز میں رقم طراز کیا گیا ہے جو کسی بھی لمحے طبیعت پر بوجھل پن کا احساس تک نہیں ہونے دیتے۔

کتاب کا انتساب ''حضرت فاطمہؓ کے بابا حسنینؓ کے نانا۔ وجہ تخلیق کائنات۔ سرکارؐ دوعالم کے نام'' ہے۔ پُرمغز پیش لفظ بعنوان ''حالاتِ حافظہ'' میں مصنف نے کتاب کے مرکزی خیال کو باخوبی سمونے کی سعی کی ہے۔ عنوان ''ظفریات'' اور حمدان خالد کے تخلیق کردہ خوبصورت سرورق پر مصنف ظفر اقبال ظفر کا دلفریب عکس کتاب کو خودنوشت یا آپ بیتی ہونے کا تاثر تو دے رہے ہیں مگر 24 مضامین پر مشتمل اِس کتاب کے مکمل مطالعہ سے ہی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کتاب کا سارا متن سوانح عمری کے دائرہ کار میں نہیں۔ ''ظفریات'' مصنف کے زندگی بھر کے تلخ تجربات، مشاہدات، احساسات، جذبات، نشیب و فراز اور وارداتِ قلبی کا منفرد انداز و بیان میں خوبصورت اظہار ہے۔ معروف رائیٹر و فلم ساز ناصر ادیب کی رائے میں ''ظفر اقبال ظفر سمندر کے

حسیب اعجاز عاشر

کنارے جا کر سطح پر آنے والی مچھلیوں کو نہیں پکڑتا بلکہ سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور اُس کی گہرائیوں میں اُتر کر وہاں سے ہیرے موتی اپنے لفظوں کے جال میں اکٹھے کر کے لاتا ہے۔ جبکہ نامور موٹیویشنل اسپیکر و ادیب قاسم علی شاہ کی نظر میں ''ظفر اقبال ظفر نے مضامین کا انتخاب بہت عمدگی سے کیا ہے جو کہ سماجی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کر کے لوگوں میں شعور اجاگر کرنے کا سبب بنے گا''

مصنف نے اپنے مضمون ''سرکارِ دو عالم حضرت محمدؐ کی محبت کے نام'' میں اِس حقیقت کو بیان کرنے کی سعی کی ہے کہ عشق وہ نہیں جو صرف زبان پر مچلے بلکہ عشق وہ ہے جو سینے میں چھپے دل کے اندر ہو اور وہ چہرے و کردار سے جھلکے بھی۔ جب تک آپؐ کا غم ہمارا غم نہیں بنے گا، آپؐ کی تڑپ ہماری تڑپ نہیں بنے گی، آپؐ کی فکر ہماری فکر نہیں بنے گی ہم صرف نام کے عاشق رہے گے۔ کتاب میں شامل ''مکہ مدینہ کا خوابی سفر نامہ'' ایک ایسے سفرِ لبیک اور خاص کیفیتِ سفر کی مہکتی داستان ہے جو قاری کے دل کو نہیں بلکہ روح کو بھی منور کر دیتی ہے کہ احساس ہونے لگتا ہے کہ پردے دھیرے دھیرے سے اُٹھنے لگے ہیں جو فاصلے کل تک بڑے طویل لگ رہے تھے آج مٹنے لگے ہیں، چشم تصور وہ مناظر ہو بہو اپنے سامنے دیکھنے لگے ہیں اور روح اختیار کی قید سے آزاد ہونے کو ہے، لوحِ جبیں ناقابل بیان کیفیت کی حالت میں ربِ کائنات کے قدموں میں سجدہ ریز بھی ہو رہی ہے۔ زبان اعتراف خطاؤں کو مچلنے لگی ہے اور جھکی، شرمندہ آنکھوں سے ندامت کے آنسوؤں کا سمندر اُمڈنے کو ہے۔ مصنف کو اپنے اِس روحانی سفر کے قدم قدم پر جو جو روح پرور مناظر اپنے حصار و طلسم میں لئے چلے گئے وہ اُنہیں من و عن قرطاس پر ایسے ایمان افروز منظر کشی کے ساتھ منتقل کرتے چلے گئے کہ یہ تحریر قاری کو اپنے ساتھ ساتھ کبھی مکے کی گلیوں میں اور کبھی مدینے کے کوچوں میں ساتھ لئے پھرتی ہے۔

ایک طرف ''ظفریات'' دردمندی اور دانشوری کا ایک حسین امتزاج ہے اور دوسری طرف سماجی و تہذیبی شکست و ریخت سے دوچار معاشرتی رویوں سے خوب اظہارِ ناراضی کے لیے الفاظ کے چناؤ میں تلخی اور کاٹ بھی ہے۔ ''جہیز کا خاتمہ مرد کی مشکل آسان کرے گا'' جیسے مضمون عہدِ حاضر میں ایسی تحریر شدید گرم موسم میں سڑک کنارے شدتِ پیاس سے دم توڑتی معصوم چڑیا کے منہ میں ایک گھونٹ پانی ڈالنے کے مترادف ہے کہ کیسے قلم سے معاشرے کی تشکیل کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ذمہ دار طبقے کی حساسیت و شعور عوام کے حقیقی مسائل سے آشنا نظر آ رہی ہے اور اِس کے ادراک کے لیے سنجیدگی سے ایک فکر کو اُجاگر کرنے کے لیے کوشاں بھی ہے۔

''تو اور تیرا سب کچھ تیرے باپ کا ہے''، ''بچوں کی بات بڑوں کے ساتھ - سکول کی یادیں''، ''کامیابی کی منفرد نظیر امتیاز بشیر''، ''میرا ہمزاد عارف لوہار'' اور ''شافع محشر'' کے مولف میاں محمد اسلم جاوید کے نام'' جیسے مضامین صاحب کتاب

کی پرانی حسین یادوں، ان سے جڑے مقدس رشتے ناطوں، ان بے مثال رشتے ناطوں کی عظمت و اہمیت اور کچھ بچھڑے ہوئے انمول کرداروں کے سنگ گزرے شب و روز سے مہک رہے ہیں۔ ''انسان کی خدائی محبت کا نام ماں ہے'' میں مصنف نے اِس راز کو بھی فاش کیا ہے کہ ماں کو دی گئی اُن کے مقام کے شایانِ شان محبت اور احترام کا صلہ ہے کہ آج اللہ رب العزت ظفر اقبال ظفر کی جھولی محبتوں، مقام، عزتوں اور احترام سے بھر رہا ہے۔ ''عورت اور گھر داری'' میں مصنف نے اِس اہمیت کو اُجاگر کیا ہے کہ کاش میاں اور بیوی کو اپنے اپنے فرائض بارے احساس ذمہ داری ہو جائے، دونوں اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے بجائے فرائض کی ادائیگی سے اپنے گھر کو جنت بنائیں۔ مضمون بعنوان ''آسمانی شادی'' قاری کے اندر ایک نئی فکر و تحریک کو جنم دیتا ہے مگر مطالعہ شرط ہے۔ مضمون ''کتاب سے قلم کا سفر'' میں مصنف اپنی اُس دعا کا تذکرہ کر رہے ہیں جو بارگاہِ الٰہی کے حضور دست بستہ کی گئی کہ ''مالک میرا لکھنا اگر تجھے پسند نہیں تو میرے دل میں اُتار دے میں قلم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور اگر تو نے پسند کیا ہے تو اسے بندوں کی بھی پسند بنا دے'' پھر چشم فلک نے وہ قابل رشک مناظر بھی دیکھے کہ کیسے مصنف کے مضامین پاکستان بھر کے معروف اردو اخبارات میں ہی نہیں بلکہ سرحد پار ہندی جرائد و اخبارات کے زینت بھی بنے۔ جب حوصلے جواں ہوں، عزم بلند ہو، نیت صاف ہو اور ایک اللہ پر یقین کامل ہو تو منزلیں خود چل کر ایسے ہی قدموں تلے آ بچھتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں رقم لفظ لفظ ایک داستان ہے جو قارئین کے دلوں پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ الفاظ کیسے کیسے کن کن جادوگریوں سے قاری کو اپنے سحر میں لے لیتے ہیں یہ راقم الحروف کے بے ترتیب جملوں سے نہیں بلکہ کتاب کے مطالعے سے جانا جا سکتا ہے۔ دھنک مطبوعات کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اِس 96 صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت صرف دعائیں ہیں۔ اِس کے مطالعے کی اہمیت کا اندازہ ناصر ادیب کی اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''یہ کتاب ہر صاحب اولاد آدمی کے تکیے کے نیچے ہونی چاہیے''۔ مصنف لکھتے ہیں کہ ''میرے حالات ایسے ہیں کہ کسی استاد کو شاگردی کے لئے وقت دے سکا اور نہ ہی وقت نے مجھے کوئی ایسا استاد دیا۔ میرے لئے کتاب ہی اُستاد ہے''۔ مگر مطالعہ ''ظفریات'' تو کچھ اور ہی عندیہ دے رہا ہے کہ موصوف کو الفاظ کے چناؤ اور موقع محل کے مطابق بااحسن خوبی استعمال پر ایسی خوب دسترس ہے کہ یہ اُستادیاں تو اُستادوں کے اُستاد ہی لگا سکتے ہیں، بہرحال ''ظفریات'' کے مطالعہ سے کہیں کہیں یہ احساس قاری کی سوچ دستک ضرور دیتا ہے کہ مصنف کے اندر ابھی بڑے سوالات پوشیدہ ہیں جو اِن کی نئی کتاب میں بے نقاب ہوں گے یعنی اُستادیاں ابھی باقی ہیں۔ قلم قبیلہ اپنے اِس پیارے دوست کی مزید ترقی و کامرانی کے لیے تہہ دل سے دعا گو ہے۔

☆☆☆☆☆

ستارے ہم سفر میرے.....امتیاز گلیانوی

شعروادب سے وابستہ افراد بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہے ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی سیماب صفت طبیعت اُنھیں اظہار کے نئے نئے رستے تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے چنانچہ وہ کبھی شعر کہتے ہیں۔ کبھی افسانہ لکھتے ہیں۔ کبھی ناول یا سفرنامہ تحریر کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کے ذہن رسا کو ایک اطمینان اور سکون ملتا ہے اور وہ ادبی سفر مختلف انداز میں طے کرتے رہتے ہیں۔

اگر دنیا بھر کے ادب پر نظر ڈالی جائے تو اُس میں بہت کم ایسی شخصیات ملیں گی جنھوں نے ادب کے کسی ایک شعبہ میں اپنی صلاحیتیں منوائی ہوں۔ بیشتر ایسے تھے جنھوں نے بیک وقت شاعری کی۔ افسانے لکھے، ناول لکھے، تنقید نگاری کی اور ادب کی مختلف جہتوں میں اپنے رنگ بکھیرے۔ گوئٹے اور شیکسپیئر کے نام اِن میں سب سے بڑی مثال ہیں۔

ہمارے ہم عصر امتیاز گلیانوی بھی ایسے ہی قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ایک سے زائد شعبوں میں طبع آزمائی کی اور کامیاب قرار پائے۔ 90ء کی دہائی میں جب وہ نوجوان تھے تو شاعری سے آغاز کیا، باقاعدہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے مگر اُن کی پارہ صفت نے انھیں شاعری سے ہٹا کر افسانوں کی طرف لگا دیا اور چند برسوں میں ہی اُن کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو کر اہلِ علم و ہنر سے پزیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی سوانح حیات بھی ''امتیاز نامہ'' کے نام سے لکھ کر داد و تحسین سمیٹی ہے، مگر وہ جو اُن کی پہلی محبت یعنی شاعری تھی، اُس نے اُن کا دامن نہیں چھوڑا اور ذہن کے نہاں خانوں میں پرورش پاتی رہی چنانچہ گزشتہ عرصہ میں انھوں نے اچھی خاصی غزلیں کہہ ڈالیں جو کہ اب ''ستارے ہم سفر ہیں'' کے عنوان سے شعری مجموعہ کی شکل میں سامنے آچکی ہیں۔ اس میں اُن کے کالج کے زمانے کی ابتدائی غزلیں بھی شامل ہیں۔

امتیاز گلیانوی کا شعری کینوس اپنے ارد گرد کے ماحول اور سماجی و عصری معاملات پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے جذبات و احساسات سے رنگ رنگیلی تصویریں بناتے ہیں جو شعر کے زاویے میں ڈھل کر قاری کو لُطف آشنا کرتے ہیں۔ ان رنگین و دلکش تصاویر میں جہاں شعری اپروچ ملتی ہے وہاں مصورانہ عکس ریزی بھی دکھائی دیتی ہے یعنی وہ شاعری سے مصوری کا کام لیتے ہیں۔ اس تناظر میں اُن کے یہ اشعار دیکھیے:

آفتاب خان

بُھلانے والے ترے ہاتھ کے اشارے پر
کھڑا ہوں آج بھی مَیں دوسرے کنارے پر

چہرے پہ کھل اُٹھا مرے، سرسوں کا رنگ بھی
اتنا شدید یاد وہ آتا رہا مجھے

سرسراہٹیں دل میں اس لیے تو ہوتی ہیں
پاس ہی تو پنگھٹ ہے، پاس ہی تو پیلا ہے

.....

امتیاز گلیانوی کی شاعری میں سادگی اور برجستگی ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی طرح بہت گہرائی میں جاکر بات کرنے کے بجائے سیدھے سادھے انداز میں اپنا خیال پیش کیا ہے، جس کے لیے تشبیہات واستعارات کے استعمال کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور آج کل ایسی ہی سادہ انداز بیان کی شاعری پسند کی جارہی ہے۔ اُن کی شاعری کے حوالے سے معروف شاعر ادیب اور نقاد ڈاکٹر نثار ترابی لکھتے ہیں کہ:

''سراہنے کی بات یہ ہے کہ شاعر نے کہیں بھی بناوٹی طرز کو اپنانے کا جتن نہیں کیا۔ یہ قلبی واردات واظہار کا سیدھا سچا اظہار ہے۔ شاعر نے دھرتی، سماج اور اپنے دیسی اور ولایتی ماحول کو اپنی آنکھوں سے دُور نہیں ہونے دیا۔''

امتیاز گلیانوی نے دور وقریب سے ایک دُنیا دیکھ رکھی ہے اس لیے وہ اپنے گرد وپیش کے واقعات وحالات کو اپنا شعری اثاثہ بناتے ہیں۔ وہ عہدِ رواں اور عہدِ قدیم کے انسانی رویّوں کے پارکھ ہیں اور پھر افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک گہرا مشاہدہ بھی ان کے ہم رکاب ہے اس لیے سماجیات اور عصرِ رواں پر شعر کہنے کے لیے اُن کے پاس بہت سا مواد موجود ہے جسے انھوں نے اپنی شاعری میں بہترین انداز سے برتا ہے اور ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جو ہر دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً:

پھولوں کا ہم مزاج تھا سویا نہ رات بھر
کانٹوں کے فرش پر اُسے راحت نہ مل سکی

زندگی بتاؤں کیا ، زندگی جھمیلا ہے
اُس نے مجھ کو جھیلا ہے، میں نے اُس کو جھیلا ہے

ہمارے ذہنوں پہ چپ کی تختی ہیں مہریں سی
ہمارے ذہنوں میں کتنا اُبال ہے مُرشد

ہوائیں چار سُو نوحہ کناں ہیں
لہو چاروں طرف بکھرا ہوا ہے

روز مرتے ہیں بھوک سے بچے
اِن غریبوں کا کوئی حال نہیں

.....

امتیاز گلیانوی کے اس شعری مجموعے میں جہاں عصری منظرنامہ دکھائی دیتا ہے وہاں ذات سے ذات تک پھیلی تنہائی اور ہجر کی کڑی سیاہ راتوں کے نوحے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قلبی واردات کو سیدھے سبھاؤ بیان کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور معاملاتِ حسن وعشق کو بھی داخلی شاعری سے جوڑ کر بلند خیالی کی طرف سفر کیا ہے۔ سو اِس شاعری میں ان کی دلی کیفیات کے ساتھ اُن کی دھرتی کی سوندھی خوشبو بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک خواب پرست نوجوان کے دل سے نکلی ہوئی شاعری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تیری جانب تو آ نہیں سکتا
میں تو اپنی طرف روانہ ہوں

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی اور ان کا حمدیہ مجموعہ ''کن فیکون''

ریاض ندیم نیازی صاحب نے بلوچستان میں مستقل ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں لیکن آبائی وطن میانوالی کی محبت ان کے دل میں برابر موجود ہے۔ بڑے عاجز، منکسر المزاج اور نفیس نیازی ہیں۔ سبی میں زندگی کی نصف صدی سے زائد عمر گزار چکنے کے باوجود آج بھی ان کی گفت گو میں ان کے خالص میانوالین لہجے کی خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی ہے۔

خوش نصیب ہیں قدرت نے انہیں تخلیق شعر کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔ متعدد مجموعہ ہائے شعر ''ماورا پبلشرز لاہور'' ایسے ادارے سے آچکے ہیں۔ قومی و صوبائی سیرت ایوارڈز کے علاوہ متعدد اعزازات انہیں قدرت نے عطا کیے ہیں۔ لگتا ہے خالق کو ان کے مزاج کی یہی سادگی و درویشی کی ادا پسند ہے۔ ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی ہی نہیں کی اپنے فن کا لوہا بھی منوا چکے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات میں پر وقار شاندار اور جاندار انداز میں نمائندگی کر رہے ہیں۔ یہ ان کی محبت ہے کہ منظرِ عام پر آنے والے ہر ادبی شہ کار سے نوازتے ہیں۔

رمضان المبارک جیسے بابرکت مہینے میں ''کن فیکون'' کا منظرِ عام پر آنا اور ہمیں نصیب ہونا ان کی قبولیت اور ہماری خوش بختی ہے۔ حمد و نعت کہنا اگرچہ اتنا آسان نہیں انتہائی احتیاط اور آداب کو ملحوظ رکھنے والا کارِ دشوار ہے مگر — یہ اس کی دَین ہے۔ بڑے ہی دیدہ زیب اور موضوع کے شایانِ شان گیٹ اپ کے ساتھ حمد و نعت کے معتبر ناموں کی سند کے ساتھ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جن بڑے ناموں میں مظفر وارثی، راجا رشید محمود، ملک نعیم جاوید، جلیل عالی، خیام العصر محسن اعظم ملیح آبادی، واجد امیر طاہر سلطانی اور خالد شریف شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ہر صنف کا احاطہ کرتی اک ایک حمد پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دعا ہے ان کی یہ عقیدت و عبادت بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو۔

☆☆☆☆☆

سنی ذیشان علی پوری

عابد معروف کے شہرِ بے اماں میں، چند لمحے

اس شہرِ بے اماں میں، عابد معروف کا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا تعلق پاکستان کے شہر راولپنڈی سے ہے۔ پیشے کے لحاظ سے ایڈووکیٹ ہیں اور راولپنڈی بار کونسل سے منسلک ہیں۔ مجموعہ کا سال اشاعت 2010 ہے۔ جسے روزن پبلی کیشن نے گجرات سے شائع کیا ہے۔ ندیم ہاشمی، ثاقب امام رضوی اور حسنین سعید نے ان کی شاعری اور شخصیت پر مضامین لکھے ہیں۔ عابد معروف خود اعتراف محبت کے عنوان سے ابتدائیہ میں اپنے شعری سفر کے حوالے سے دوستوں اور ان کی محبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

ابتدا میں حمد، نعت شریف اور منقبت ہے۔ اور اس کے بعد ان کی غزلیں ہیں،

عابد معروف کی شاعری دھیمے سروں کی برکھا ہے۔ جس میں سرسوں کے کھیتوں اور پہاڑوں کی شاموں جیسی نرماہٹ اور کہیں کہیں زندگی کی دوپہروں جیسی حبس بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزل کے موضوعات میں زندگی کے رنگوں کی جھلک، اپنے درد اور آس پڑوس کے دکھ بھی ان شعروں میں پروئے ہوئے ہیں۔۔ سوشل میڈیا نے فاصلے سمیٹ دیئے۔ انسان اب ایک کلک پر دنیا بھر سے رابطے میں ہے۔ یہ فاصلوں کا سمٹنا ادب اور شعر سے جڑے ہوئے صارفین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ ہم اب بہت کم وقت میں دوسروں کے خیال سوچ اور ان کے تجربوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ نئی قربتیں ہمیں نیا شعور اور دوسروں کی سوچوں، خیالات اور مشاہدے میں شریک کرتی ہیں۔ اگرچہ انسانوں کے درمیان سرحدیں اب بھی موجود ہیں۔ لیکن سوشل میڈیا نے ان سرحدوں کی رکاوٹوں کو بہت آساں کر دیا ہے۔۔

میرے اندر حرا تصور ہو
تیرے ہونے کی روشنی چاہوں

اب مجھے یاد وہ نہیں کرتا
کیا مجھے ہچکیاں نہ آئیں گی

سوچ کیسے تو بچ گیا پنچھی
شہر کا شہر ہی شکاری تھا

کیسے تمثیل مکمل ہو مری
ایک کردار بہت مشکل ہے

ماں کا آنچل نہ گر رہا سر پر
وقت کی دھوپ کاٹ کھائے گی

اور کچھ بھی نہیں طلب اپنی
ایک روٹی کی بس ضرورت ہے

آج کچھ کام کر نہ پاؤں گا
آج ناساز کچھ طبیعت ہے

رشیدہ منصوری

جب بچھڑنے کا ہی ارادہ ہو
کیا؟ ضروری ہے پہلے جھگڑا ہو

مختصر بحر کی یہ غزلیں معنوی وسعت کی حامل ہیں۔ غزل کی جمالیات نئی روایت میں نظم کے مضامین کو اپنے اندر سمو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں غم جاناں، دل اور احساس کی کیفیات ہی نہیں۔ یہاں دنیا کے سارے غم موجود ہیں۔ شہر کی گلیاں محبوب کی یاد دلاتی ہیں۔ اور صدیوں پر پھیلے درد کئی نسلوں کے دکھ تازہ کرتے ہیں۔ عابد معروف بھی اپنی نسل اور اپنی نسلوں کے دکھوں کی گواہی لے کے آئے ہیں۔ اس شہر بے اماں میں۔ محبت امن اور رواداری کا چلن کہانی ہونے لگا ہے۔ یہ جو کہانی پار ہے وہی ہم یہاں سہتے ہیں۔ شاعر ہی جو ہر انسان اور ہر جاندار کے دکھوں کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ تو خدا کے دکھ بھی بانٹنے سے باز نہیں آتا۔ عابد معروف بھوک غربت بے بسی اور شجر کا دکھ جانتا اور پرسہ کے لیے اپنے شعر دم کر دیتا ہے۔ آپ اس انتخاب سے جان سکتے ہیں۔ کہ دھیمے سے نرم لہجے کا یہ شاعر فطرت کا سا مزاج رکھتا ہے۔ قبولیت اور تسلیم کی خوشبو میں در آئے تو ایسی شاعری، بس محبت اور امن کا منشور ہے۔

شہر کی ہر گلی رلاتی ہے
مجھ کو تیری کمی رلاتی ہے

ایک بھی حرف سچ نہیں بولا
اس کو جلدی تھی چھوڑ جانے میں

کبھی تم کربلا میں جا کے دیکھو
وہاں کیسی بلا کی روشنی ہے

محبت ہے حسین ابنِ علی سے
یہی میری انا کی روشنی ہے

کیا جانے کیوں پنچھی سہمے سہمے تھے
پتوں کا جب رقص بپا تھا پیڑوں پر

کربلائے زیست سے آنکھیں کون چرا سکتا ہے۔ شاعر بھی کبھی کے درد چنتا اور دامن میں رکھ دیتا ہے یہ خبر ہے کہ درد بانٹے جا سکتے ہیں۔ فکر کی شاخ کے یہ ثمر انسانی غموں کا مرہم اور اب حیات بھی ہیں۔

کبھی کے درد جھولی میں سمیٹے
سخنور دائروں میں گھومتا ہے

کتنی خوش بخت تخیل کی گھڑی ہے وہ
فکر کی شاخ پہ جس وقت ثمر آتا ہے

مجھ کو سولی چڑھایا جانا ہے
مجھ پر تعزیر ہے محبت کی

ظلمتوں کی سمجھ سے باہر ہے
کیسے نکلی تھی جاں چراغوں کی

لکھتے ہیں ابھرتے ہوئے سورج کی ضیائیں
ڈھلتی سی کسی شام کے سائے نہیں لکھتے

پہلے گھر میں ایک ہی کمرا ہوتا تھا
اب تو اپنے اپنے کمرے ہوتے ہیں

بس ہلا کر ذرا زمیں رب نے
اس زمانے کے بل نکالے ہیں

وقت سیڑھی ہے ایک اُلجھی سی
جو بھی پھسلے سنبھل نہیں سکتا

پربت بیلے دریا جھرنے ہر شاعر کے استعارے ہیں۔ وہ اپنے طلازمات میں داستاں کو بھی سمو دیتا ہے۔ یہاں ہمیں بہت سے آشوب دکھائی دیتے...

☆☆☆☆☆

رحمت العالمین حضرت محمدؐ کی محبت بگڑی بات بنا دیتی ہے

دادا جی کے گاؤں بچپن کے دنوں میں دادی جان ہمیں ہمسائیوں کے گھر برتن میں کھانے کی اشیاء ڈال کر بھیجتی تھیں تو اگلے گھر سے بھی واپس برتن میں کچھ ڈال کر لوٹایا جاتا میں سوچنے لگا خدا کے ہاں جانے والے عمل اس سے بھی زیادہ حسین سخاوت کے مقام پر ہوتے ہیں۔ جب مجھے دشمن نفس کی پہچان ہونے لگی تو میں بہت دور نکل چکا تھا مجھے اپنے خساروں کا علم پچھتاوے کی صورت ستانے لگا۔ زندگی کی عصر تک پہنچ کر یہ احساس ہوا ہے مغرب سر پر ہے عشاء ہونے کی دیر ہے پھر ہمیشہ زندگی کے لیے کالی رات کی آغوش میں چلی جانی ہے اتنے سے وقت میں گزری حیات کی قضاؤں کا کفارہ کیسے ادا ہو سکے گا؟ میرے لیے دنیا کے سارے معاملے بے معنی ہو کر رہ گئے آخرت والی نفس و نفسی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں خدا کے حضور آنکھوں کے کٹوروں میں ندامت و شرمندگی کے اشک بھر کر پیش کرنے گیا اور گمان تھا کہ خدا کی جانب سے دل کا برتن معافی کے تحفے سے بھر کر واپس لوٹے گا--- ایسا نہیں ہوا یہ گاؤں نہیں ہے ظفر خدا کی مرضی کا جہان ہے۔ میرے لیے خالی برتن کا لوٹنا بہت المناک تھا میں اس گمان میں رنجیدہ تھا کہ ایسی کیا خطا ہے جو خدا کے انکار کی صورت بنی۔ ندامت کے آنسوؤں سے تو توبہ کے مرجھائے پھولوں پر بھی بہار آ جاتی ہے مگر اس وقت میرے وجود کے آنگن میں گردش کرتی خزاں میں امید کے درخت سے آس کے گرتے زرد پتوں کی کھنکھناہٹ کا ماحول طاری تھا۔ مجھے سمجھ آ چکا تھا خدا ویسا نہیں جیسا فرقہ و جماعت پرست مولوی و پیر نذرانوں کے عوض بیچتے ہیں خدا اور ہی طرح کا مزاج و معاملہ رکھتا ہے میں بارگاہ خداوندی سے اپنے اعمال نامے کی طرح دل کا خالی برتن ہاتھوں میں لیے لوٹ آیا--- مگر مایوس نہیں تھا کیونکہ میں اُس ہستی کو جانتا مانتا چاہتا ہوں جن کی خدا کوئی بات رد نہیں کرتا۔ میں مال اور اعمال کا کنگال بندہ عالم تنہائی میں پرواز روح سے مدینہ منورہ کا یہ تصوراتی منظر سجا بیٹھا کہ میں مسجد نبویؐ میں عین روضہ مبارک کے سامنے ادا ئیگی نماز توبہ میں رب کو سجدہ اس طرح کر رہا ہوں کہ سر بھی حضورؐ کے سامنے جھک رہا ہے خدا کی عبادت اور حضورؐ کے ادب کا اشتراک حیات ایمان کے وقت کو قبولیت کے قابل بنا رہا تھا پچھلی زندگی مدینہ کی یادوں میں جو تڑپتے ہوئے

ظفر اقبال ظفر

گزاری وہ حالت بے قراری ایک طرف مگر مدینہ سے واپس جانے کی تڑپ جسم سے روح جدا ہونے والی اذیت میں مبتلا کیے ہوئے ہوتی تھی مدینہ سے واپسی کا ختم ہوتا وقت زندگی کے آخری وقت کی طرح لحہ لحہ جان پہ بھاری گزرنے لگا اور دل وروح کے جڑے رابطے بحال رکھنے کو یہ حسرت شدت سے مچلنے لگی کہ کسی طرح حضورؐ کو ساتھ لے جاؤں یا خود کو حضورؐ کے پاس چھوڑ جاؤں ایک کام تو لازمی ہو جائے تاکہ باقی کا جینا آسان ہو سکے۔ میں شدت سے یہ چاہنے لگا کہ مسجد نبویؐ کا داخلی دروازہ جہاں جوتے اتار کر پہلا قدم رکھتے ہیں وہاں اپنے دل کو نصب کر دوں کہ در حضورؐ کے ہر مسافر کے پیروں کے تلوے میرے دل پر آئیں اور یہ بوسے لیتا جائے اس منظر کو حضورؐ دیکھ لیں اور تبسم فرما کر ملائیکہ کو حکم فرمائیں اس دل کو اُٹھا کر میرے پاس رکھ دو ہم نے اسے شرف توجہ بخش دیا ہے۔ اکبر اللہ--- یہ سنتے ہی خوشبو کی ایسی لپٹ آئی کہ جسم وروح کو معطر کر کے اپنے حصار میں لے لیا یہ منگتا سخاوت کے آسمان تلے کھڑا کرم کی بارش کو سمیٹنے میں اپنا تنگ دامن پھیلانے کی ناکام کوشش کیے جا رہا تھا۔ پھر احساس توجہ رسولؐ اللہ میں عرض کرتا ہوں حضورؐ خدا سے خدا کو مانگتا ہوں تو آپؐ کی جانب بھیج دیا جاتا ہوں۔ آپ ذات خدا کا رستہ بھی ہیں دروازہ بھی ہیں اور سلیقہ سفر بھی ہیں-- حضورؐ خدا کی توجہ کا طلبگار ہوں سفارش فرما دیجئے--- پھر یکدم خیال آیا ارے پگلے نگاہ مصطفیٰؐ ہی تو نگاہ خدا ہے۔ آرزو پیش کر-- روح پہ یہ الفاظ القاء ہوئے۔ مانگ کیا مانگتا ہے محمدؐ کے رب سے؟ میں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا اے محمدؐ کے خدا مجھ ناکارہ و گنہگار کو ایسے حالات وسائل عطا فرمائیے کہ میں اپنے ماں باپ کو بیت اللہ اور روضہ رسولؐ کے سامنے کھڑا کر کے یہ شہادتی الفاظ کہلواؤں کہ اے خدا اور محبوب خدا ہم نے اس دُکھ دینے والے کو معاف کر دیا ہے آپ بھی معاف فرما دیجئے۔ ماں باپ کے لبوں سے نکلتے یہ لفظ خانہ کعبہ کی جانب روانہ ہوئے جیسے ہی وہ اندر گئے میرے اندر کے سارے بوجھ باہر آ گئے میں ماں باپ اور میرے درمیان احساس رضا خداوندی جسموں میں سرائیت کرنے لگا۔ میرے لیے یہ کام قبر میں نور کا چراغ رکھنے جیسا تھا۔ یہی وہ معاملات کی خرابی تھی جس کی وجہ سے خدا کی بارگاہ میں میری ذات پہ سے دھیان اُٹھا لیا گیا تھا جب خدا مانا چاہتا ہے تو وہ والدین کے اندر سے اپنی ذات کے راستے جوڑتا ہے اور جب والدین بھی نا مانیں تو حضور نبی کریم کی جانب راغب ہوں جو گزرے وقت کو بھی سدھارنے پر قدرت رکھتی ہے قربان جاؤں اپنے رب پہ جس نے میرے بابا آدمؑ کی روح سے بھی پہلے میرے آقا کریمؐ کا نور پیدا فرما کر عالمین پر اپنا کرم رکھ دیا۔ پھر ہمیں تقسیم وقت کے اُس حصے میں رکھ دیا جہاں حضورؐ ہم سے پہلے آ کر ہمارے لیے دنیا و آخرت کی آسانیاں پیدا فرما گئے مجھے یہ جان کر اتنی خوشی نہیں ہوتی کہ دنیا میں آنے سے پہلے ہم سب عالم ارواح میں تھے جتنی یہ جان کر ہوتی ہے کہ ہم دنیا میں آنے سے پہلے سب حضورؐ کے عالم دعا میں تھے۔ حضورؐ آپ کے پوشیدہ احسانات روح چیخ چیخ کر بیان کرتی ہے۔ تصور میں ہی سہی مگر مجھے اپنے پاس رکھ لیجئے--- حضورؐ اپنے قریب کسی کونے میں تعینات فرما دیجئے--

☆☆☆☆☆

معروف اشعار، غیر معروف شعرا .....

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ہے
پنڈت مہتاب رائے

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے
ظریف لکھنوی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے
احمد حسین امیر اللہ تسلیم

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی
فکر یزدانی رامپوری

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے
مرزا قربان علی سالک

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے
شہیر مچھلی شہری

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
برق لکھنوی

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

.....

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
ثاقب لکھنوی

اک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکیب
دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے
شکیب جلالی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

.....

نورِ خدا ہے کفر کی حالت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
مولانا ظفر علی خان

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا
نواب محمد یار خان امیر

تندی باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے
سید صادق حسین

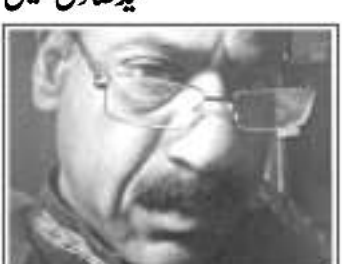

نبیل قیصر

''نیکیاں برائے فروخت'' [طنز و مزاح]

لیجئے جناب یہ دلچسپ خبر سن لیجیے؛ کل ہی کے اخبار کی ایک سرخی ہے کہ؛

گجرات کے تھانہ گلیانہ کی پولیس نے پیسوں کے عوض نیکیاں فروخت کرنے کے دعویدار نوسرباز کو گرفتار کرلیا۔

پولیس کے مطابق ملزم نے چندے کی باقاعدہ رسیدیں بھی چھاپ رکھی تھیں، اس نے دس روپے میں ایک لاکھ نیکیاں اور سو روپے میں ایک کروڑ نیکیوں کی فراہمی کی باقاعدہ رسیدیں بھی بنا رکھی تھیں۔

ملزم ایک ہزار روپے میں ایک ارب اور دس ہزار میں ایک کھرب نیکیوں کی رسید بھی تقسیم کرتا تھا''۔

دلچسپی کا باعث بننے والی یہ خبر آج کل کے زمانے اور ہماری موجودہ حالات کی مناسبت سے کچھ اتنی بھی حیرت انگیز نہیں کہ ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں یا ہم ترنگ و سرور میں آکر ڈھول بجانا ہی شروع کردیں - ہمارے پاس ''بیچنے'' کو اب رہا ہی کیا ہے جو ہم نیکیاں نہ بیچیں، سبھی کچھ تو ہم پہلے ہی بیچ چکے ہیں - ہمارے پاس اب بیچنے کے لائق کوئی خاص چیز بچی بھی تو نہیں اور ہم اس مالک مکان کی طرح الماری میں جا کے چھپے ہیں جن کے گھر چور داخل ہوا تھا اور چوری کے لائق کوئی چیز گھر میں موجود نہ ہونے کے سبب وہ ندامت کے مارے الماری میں جا چھپے تھے۔

اس دلچسپ خبر کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ گجرات میں سرعام نیکیاں بیچنے والے ایک فرد کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ بندہ شدید مہنگائی کے اس دور میں بھی بے حساب نیکیاں انتہائی سستے داموں بیچ رہا تھا اور نیکیاں اصلی ہونے کی باقاعدہ گارنٹی بھی دے رہا تھا۔

اس پوری خبر میں دلچسپی کا سبب لفظ ''بیچنا'' ہی ہے کیونکہ ''نیکیاں کمانا'' تو شاید ہم سب نے سنا ہے مگر ''نیکیاں بیچنا'' سے ہمارا واسطہ پہلی دفعہ پڑا ہے، بہرحال یہ کچھ گھاٹے کا سودا نہیں لگ رہا؛ ہمارے ہاں بیچنے خریدنے کا دھندا تو بہت پہلے سے لگا ہوا ہے - روزمرہ استعمال کی چیزیں تو ویسے بھی ہماری دسترس سے باہر ہو چکی ہیں؛ اشیائے صرف کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں اور بہت سی ضروری چیزوں کی قیمتیں سن کر ہم فقط ان کے خواب ہی دیکھ سکتے ہیں یا ریاضی کے فارمولوں اور اصولوں کے مطابق انہیں ''فرض'' کر کے ہی تصوراتی استعمال میں لا سکتے ہیں - چنانچہ خوابوں کی دنیا یا تصوراتی صورت حال سے

نور کمال شاہ

نکل کر ذرا یہ دیکھیں کہ نیکیاں کم از کم سستی تو مل رہی ہیں- بھلا ایک اور دس روپے میں ملتا کیا ہے آج کل؛ بچے بھی صبح صبح سکول جاتے ہوئے پچاس، سو سے کم پہ راضی ہی نہیں ہوتے تو ایسی صورتحال میں میزان کے پلڑے کا وزن بڑھانے کے لئے ارزاں نیکیاں کوئی بری تجویز تو نہیں - جہنم میں رہتے ہوئے جنت کی خواہش و آرزو کوئی نامناسب فعل تو بالکل بھی نہیں-

اس مادی دنیا میں آباد بے شمار قوموں میں سے ہم ایک بڑی عجیب سی قوم رہے ہیں اور ہمارا ہر انداز ہی منفرد رہا ہے، ہر کسی سے بالکل مختلف؛ سب سے جدا؛ جبھی تو ہم اپنے کارناموں اور کرتوتوں پہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے؛ اقوام عالم کے سامنے اپنی انفرادیت کے گن گاتے نہیں تھکتے - ہماری یہ انفرادیت کیا بے مثال نہیں کہ خریدنے سے زیادہ ہمارا زور بیچنے پہ ہی مرکوز ہوتا ہے؛ چنانچہ کبھی خود کو بیچنے کے لئے پیش کر دیتے ہیں؛ کبھی کسی چوراہے پہ مست ملنگ بن کر اپنے کپڑے بیچنے کا دعوی کرتے نظر آتے ہیں تو کسی جگہ اپنے بچے بیچنے میں مشغول نظر آئیں گے- احمد فراز نے صورت حال کی کیا خوب صورت عکاسی کی ہے:

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہوں
ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

جب بیچنے والے کثرت میں ہوں تو خریدار کا کام آسان ہو جاتا ہے اور یہی صورت حال ہمارے ہاں آج کل بنی ہوئی ہے!!!!-

سو، ہم سب لگے ہوئے ہیں، منڈی سجی ہوئی ہے اور سب کچھ ہم نے بیچنے کے لئے پیش کر دیا ہے- وفاداریاں ہم بیچتے ہیں، جنت اور جہنم ہم لوگ بیچتے ہیں؛ اپنا ایمان بھی بیچتے ہیں: اپنی عزتیں فروخت کرتے ہیں؛ سب کچھ ہی بیچنے کو موجود تو ہے!!!!

خرید ہو چکی اب بیچنے کی باری ہے!!!

نوکریاں ہمارے ہاں فروخت ہو رہی ہیں؛ امتحانی نمبرات ہم بیچتے ہیں؛ عہدے بھی بیچ رہے ہیں؛ اسمبلیوں کی نشستیں اور پارٹیوں کے عہدے ہمارے ہاں فروخت ہوتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ سیاسی جماعتوں کی نامزدگیاں تک ہمارے ہاں کھلم کھلا فروخت ہوتی ہیں؛ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم زندہ قوم ہیں اور جب قوم زندہ ہو تو اس قسم کی سرگرمیاں چلتی رہتی ہیں- بے جان اور مردہ قوموں سے اس قسم کے حرکات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی-

بیچنے اور فروخت کرنے کے لئے ہم ہمیشہ نئی اور عجیب و غریب قسم کی چیزوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور جیسے ہی ہمیں کوئی نیا آئیڈیا ملتا ہے، فوراً ہی اسے عملی جامہ پہنا کر مارکیٹ میں دام اور داد دونوں ایک ساتھ لینے پہنچ جاتے ہیں- اہل وطن کو نت نئے لذیذ ذائقوں سے روشناس کرانے کے لئے کتوں اور گدھوں کا گوشت تک بیچتے ہیں- اسے اب ہماری خوش قسمتی ہی سمجھ لیجئے کہ

ہمیں ہر قسم کے خریدار آسانی سے مل جاتے ہیں جو بنا کسی پوچھ گچھ کے بھی کچھ خریدنے میں دلچسپی لیتے ہیں - ''کھانے'' اور ''کمانے'' کے لئے ہم طریقہ کار کو جائز سمجھتے ہیں - چاند تک تو خیر ابھی ہماری رسائی نہیں ہوئی البتہ ہم سے متاثر ہو کر کچھ قوموں نے، جو چاند پر قدم رکھ چکی ہیں، زمینوں اور گھروں کی فروخت شروع کر رکھی ہے کہ خدانخواستہ اگر ہماری زمین ہر رہنا ناممکن ہو جائے تو از کر چاند پر پہنچ جائیں اور اپنے خریدے گھر اور اپنی خریدی زمین میں بس کر چین کی بانسری بجائیں - اللہ کرے ہمیں بھی کبھی چاند تک رسائی نصیب ہو تو دیکھ لیجیے گا؛ ہم پورے چاند کو ہی بیچ ڈالیں گے!!!

درحقیقت ہم شروع ہی سے اس راسخ عقیدے کو تعویذ بنا کر گلے میں لٹکائے ہوئے ہیں کہ ہم پسماندہ قوم ہیں؛ معاشی لحاظ سے کمزور ہیں چنانچہ مالی کمزوری کے باعث ہماری قوت خرید لازمی طور پر متاثر ہوگی - خریدنے کی سکت نہ پا کر ہم اس کے برعکس یعنی بیچنے کی جانب دل و جاں سے نہ صرف مائل ہیں بلکہ اس کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار بھی رہتے ہیں - سبھی کچھ ہم بیچ چکے ہیں یا بیچنے کو تیار بیٹھے ہیں اور ہمارا یہ سفر کامیابی کے ساتھ جاری ہے -:

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی!!!

''بیچنے'' کے عمل میں ہم اب اتنے طاق ہو چکے ہیں کہ اپنی جان تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے - ہمارے ہاں جسم فروخت ہوتے ہیں، خون بیچا جاتا ہے؛ گردے بیچے جاتے ہیں مگر پھر بھی ہماری حس فروخت کو تسکین نہیں ملتی -

''بیچنے'' کے لئے جو جو کچھ موجود تھا اس پہ ہم ہاتھ صاف کر چکے - اب لے دے کے یہی چند چیزیں باقی رہ گئی ہیں جن کے فروخت کی ہم تیاریاں کر رہے ہیں بلکہ آغاز بھی کر دیا ہے - عنقریب ''نیکیوں'' اور ثوابوں کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی نایاب چیزیں مارکیٹ میں لانچ کر دی جائیں گی - آرام طلب اسے دھڑا دھڑ خریدیں گے اور فاقہ مست تماشہ دیکھ دیکھ کر لطف اٹھائیں گے - اخبارات اور میڈیا کو نئے نئے موضوعات ملیں گے اور سادہ لوح اپنی خریداری پر پھولے نہیں سمائیں گے - وہ دن دور نہیں جب ہم تازہ ترین مال بیچنے کے لئے مارکیٹ میں لے کر آئیں گے - خوشیاں فروخت ہوں گی؛ طاقتیں بیچی جائیں گی - محبوبائیں فروخت ہوں گی اور عشق و عاشقی پر بھی بولی لگے گی!!!!

پولیس انتظامیہ کو مشورہ ہے کہ اس قسم کی صورت حال سے گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں - یہ وقتی جوش بھاگتے وقت کی دھول بن کر جلد ہی ختم ہو جائے گا اور مارکیٹ کے طلب کی مناسبت سے جلد ہی کوئی نیا ڈرامہ لانچ کر دیا جائے گا اس لئے خوش اور مطمئن رہیں اور چین کی بانسری بجائیں!!!

☆☆☆☆☆

بھٹہ صاحب

جام صاحب کے دوست بھٹہ صاحب اپنی نوعیت کے واحد آدمی تھے۔ بھٹے رے بھٹے تیری کون سی کل سیدھی۔ بھٹہ صاحب جوانی میں ہی اپنے بالوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ جام صاحب کے بقول بھٹہ صاحب نے بال دھو دھو کے ہی کھوئے ہیں۔ وہ دن میں کم از کم دس مرتبہ شیمپو کیا کرتے تھے۔ اس لیے بال ان کے سر سے اتر کر ہاتھ میں آ گئے اور آج تک واپس سر پر نہیں لگ سکے۔ اب وہ گنجے سر کو دن میں دس مرتبہ مالش کرتے ہیں تاکہ بال دوبارہ اگ سکیں لیکن شاید جو کھیتی ایک مرتبہ ویران ہو جائے دوبارہ آباد نہیں ہو سکتی لیکن وہ کاوش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بال تو نہیں اگے مگر میدان کافی صاف اور چمکیلا ہو چکا ہے جس کو جام صاحب کبھی کبھی بطور آئینہ بھی استعمال کرتے رہتے ہیں۔

بھٹہ صاحب جو بھی کام کرتے ہیں مسلسل کرتے ہیں۔ اسی تسلسل کا سلسلہ انہوں نے فیل ہونے میں بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ پینتیس کی عمر میں بھی بی اے کا امتحان پاس کرنے میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں کی یونیورسٹیز کے مقررہ امتحانی مراحل گزارنے کے بعد زندگی بھر کے لیے نااہل ہو چکے ہیں۔ آج کل بلوچستان یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے درپے ہیں۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ خیرپور یونیورسٹی نے بھی ان کو پاس کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ اس خبر کے بعد نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ ماشاءاللہ قابلیت کے اوج معلیٰ پر فیض یاب ہیں۔ لیکن بھٹہ صاحب تمام اداروں کا امتحان ضرور لیں گے۔

بھٹہ صاحب ہر بات کم از کم دس مرتبہ دہراتے تھے پوری دنیا کو وہ بات یاد رہتی مگر وہ خود بھول جاتے۔ اس طرح ایک مرتبہ انہوں نے دعوت عام کا سندیسہ بھیجا اور کم از کم اپنی عادت کے مطابق دس مرتبہ سب دوستوں کو یاد کرایا لیکن جب تمام دوست دعوت کے مقررہ وقت پر پہنچے تو بھٹہ صاحب گھر پر موجود نہ تھے بلکہ ایک کام سے کسی دوست کے گھر تشریف لے گئے تھے اور اہم بات یہ ہے کہ وہ دوست بھی دعوت عام میں شرکت کے لیے ان کے گھر موجود تھے اور ان پر تین حرف بھیج رہے تھے۔

ایک ان کی عادت تھی کہ وہ کسی سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے۔ ان کو وہم تھا کہ اگر ان سے یہ عمل ہو گیا تو وہ ناپاک ہو جائیں گے۔ اگر یہ عمل غیر ارادی طور پر بھی سرزد ہو جاتا تو سارا دن ہاتھ دھونے میں گزار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے گھر والوں نے تمام لٹیرین کو تالے لگا رکھے تھے اور اگر ان کو حاجت بھی آئے تو ان کو اجازت نہیں دی جاتی تھی کیونکہ ڈر یہ ہوتا تھا کہ وہ پانی کی ٹینکی ختم کر کے آئیں گے اگر وہ بیت الخلا میں دس منٹ سے زیادہ لگاتے تو ان کی والدہ پانی بند کر دیتیں تاکہ بھٹہ صاحب باہر تشریف لے آئیں۔ نل پر جھک جھک کے ان کی کمر پر بل پڑ گئے تھے اور کب نمایاں ہو گیا تھا۔

بھٹہ صاحب المعروف صفائی والا مشہور ہو چکے تھے۔ محلے کے بچے ان کا دور سے استقبال کرتے بھٹہ صفائی والا بھٹہ صفائی والا کے نعرے گونجنے لگتے۔ وہ بچوں کے پیچھے بھاگتے لیکن بچے کورس میں مل کر صفائی والا صفائی والا پکارے جاتے اور ان کو وہاں سے رفو چکر ہونا پڑتا۔

ان کو چائے پینے کا بہت شوق تھا سارا دن صرف چائے پیتے تھے۔ گھر کا دودھ، پتی، چینی ختم کر جاتے۔ وہ فرماتے تھے کہ ان کی رگوں میں خون کے بجائے چائے گردش کرتی ہے۔ بھٹہ صاحب کے پورے گھر کا بجٹ ان کے چائے کے خرچہ سے کم تھا۔ ان کے والد صاحب نے مجبوراً باورچی خانے کی الماری کو تالا لگا دیا تاکہ چائے پینے پر پابندی لگا سکیں۔

جام صاحب فرماتے ہیں کہ وہ بھٹہ صاحب کے لیے دعا گو ہیں کہ وہ اپنا تسلسل جاری رکھیں اور نئی نسل کے لیے مشعل راہ بنیں۔

☆☆☆☆☆

محمد کلیم

طنز و مزاح کا چھوٹا ڈان [اشفاق احمد ورک]

میری کتاب کلوزاپ کا دوسرا ایڈیشن اور اشفاق احمد ورک کے خاکوں کا مجموعہ قلمی دشمنی 1992 میں الحمد پبلشرز نے شائع کیں تھیں - اُسی ادارے کی سیڑھیاں چڑھتے اُترتے الحمد پڑھتے کسی لمحے میں ہماری ملاقات ہوئی، ہاتھ ملایا، پھر ساتھ ساتھ بیٹھے، ہاتھ پر ہاتھ مارا، اور ہنستے ہوئے گلے ملے، پھر گلے ملتے ملتے ایک دوسرے کے ایسے گلے پڑے کے پھر کس اور سے گلے ملنے اور گلے پڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی (بیگمات کو چھوڑ کر) اشفاق احمد ورک سے میری لمبی دوستی صاب سلامت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ مزاح نگار ہے اور میں خود کو بچپن سے شاعر ہی سمجھتا ہوں مجھے کیا پتہ تھا کے میرے ساتھ یاری نبھانے والا اندروں اندیں، شاعر نکل آئے گا، میرا مطلب ہے مقابلے پر آجائے گا، رب تخلیق کا بڑا کرم ہوا کہ مجھے اس کی کتاب مجال ملنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ تو باقاعدہ شاعر ہے- پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم قریب ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہتے ہیں، بقول عارف عبدالمتین:

تو میری پہچان کا دعویٰ نہ کر
میرے اندر ایک عارف اور ہے

.....

اشفاق احمد ورک، تقریباً چوکور چہرہ، عمران خانی آنکھیں، تھوڑی پر رکھی ہوئی کبھی چھوٹی کبھی موٹی ڈاھی اور ڈاڑھی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی مونچھیں، مونچھوں سے متصل چھپے ہوئے ہونٹوں پر آئی ہوئی بات اور

اعجاز رضوی

بات میں چھپی ہوئی مزاح کی چنگاری ہی اشفاق احمد ورک کی اصل پہچان ہے۔

مزاح کے حوالے سے اشفاق احمد ورک کی خوش قسمتی ہے کہ اب اس کے مدمقابل کوئی نہیں ہے ڈاکٹر یونس بٹ واصل میڈیا ہوا، میر مزاح مشتاق احمد یوسفی جنت مقامی ہوئے، استاد مکرم عطاالحق قاسمی جنگ میں کام آگئے باقی رہے تنویر حسین عفی اللہ یا پھر اپنے وحید الرحمٰن تو وہ مزاحیہ تحریروں کے دیباچہ نگار بن گئے، سو قدرت نے اشفاق احمد ورک کی، وال پر جلی حروف میں لکھ دیا:

گلیاں ہو جان سونجیاں
وچ مرزا یار پھرے

.....

ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ جہاں اشفاق احمد ورک مزاح کے ایٹم بم بنا رہا ہو، وہاں بلکل ضروری نہیں کہ کوئی بندہ اس کے ساتھ ہی پٹاخوں کی کتاب کھول لے اور حوالے کے طور پر لکھ دے:

پٹاخہ شاپ، نزد ورک ایٹم بم لیبارٹری"

.....

اشفاق احمد ورک کی نظر کمزور ہے مگر نظر کی کمزوری، دیگر کمزوریوں کو ظاہر نہ کرے، اس لیے یہ اپنی آنکھوں پر عینک لگاتا ہے، مگر جب کبھی یہ گاڑی ڈرائیو کرے تو عینک نہیں لگاتا، اس کا کہنا ہے کہ جب دوسرے ڈرائیوروں نے عینک لگائی ہوئی ہے تو میں کیوں عینک لگاؤں - اشفاق ورک کو پاکستان بیرون پاکستان کی ادبی تنظیموں کی طرف سے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں یہ جب بھی کسی صدر محفل سے ایوارڈ وصول کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے خود صدر محفل کو ٹرافی ملی ہو۔

اشفاق احمد ورک کا مجموعہ کلام مجال دیکھ کر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو طنز و مزاح نگار ہے، خاکے بھی لکھتا ہے اور یہ ہی اس کا کمال ہے، یہ شاعری کر رہا ہے۔ اس کی یہ مجال لیں جناب اب شاعری کا اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہوگا کہ بندہ خود بخود اپنا ٹارگٹ 'اچیو' کر لے، اور جو اصل ہے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں، یوں تو گزشتہ 30/32 سال سے لوگ اشفاق احمد ورک کی طرف متوجہ ہیں، کہ یہ ہی اُن کو گھاس نہیں ڈالتا اور اپنے حال میں مست رہتا ہے۔ اُسی مستی کے عالم میں پہلے یہ اپنے گاؤں سے قریب ترین جگ مگ کرتے بڑے شہر شیخوپورہ آیا، پھر شہری آداب سے واقفیت کے بعد، آہستہ آہستہ لاہور کی طرف کھسکا اور کھسکتا کھسکتا پورے کا پورا لاہور میں داخل ہو گیا یہاں آکر اس نے ایف سی کالج یونیورسٹی کو اپنا ٹھکانہ، اور اقبال ٹاؤن میں آرام خانہ بنایا اس آرام خانے کا نام اس نے ظرافت منزل رکھا، یہ ظرافت منزل دنیائے مزاح کی پہلی اور آخری منزل ہے کہ اس کو دیکھ کر بندہ یکدم سنجیدہ ہو جاتا ہے بلکہ اسی طرح جیسے کوئی روتا ہوا شخص اشفاق احمد ورک کو دیکھ لے تو اس کا ہاسا نکل جاتا ہے۔

عجب انکساری ہے، نہ اپنے ڈاکٹر ہونے کا فخر ہے نہ پروفیسر ہونے کا غرور نہ مشتاق احمد یوسفی سے تعریفی سند لینے کا اعزاز سادگی سے باتیں کرنا، جن میں سادگی اور دانش کی نمائندگی ہوتی ہو ہاتھوں میں کتابیں، ذہن میں کالم اور قلم میں روشنائی کے بجائے مزاح بھر کر چلنے والے کا ڈریس اپ ہونے کا انداز بھی کمال ہے، کوٹ پینٹ کے ساتھ پشاوری چپل، شلوار قمیض کے ساتھ قینچی چپل ہاں جس دن جینز کی نیلی پینٹ کے ساتھ بنیان نما رنگین ٹی شرٹ پہن لے، اس دن بوٹ ضروری پہنتا ہے، مگر یہ کام بھی اس وقت کرتا ہے جب اس کو یقین ہو، کے بوٹ چوری نہیں ہوں گے۔ ویسے کبھی کبھی یہ شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ بھی پہن لیتا ہے جب اُس کو یقین ہو کہ پروگرام میں خواتین کی شرکت لازمی ہو۔

اشفاق احمد ورک ایک جٹ ہے، جٹ اور بٹ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا، دونوں ہی خوب کھاتے ہیں اور دونوں ہی صنف نازک سے متاثر ہو کر اور متاثرہ ہو جاتے ہیں اور خواتین سے تعلقات بننے کے ماہر ہوتے ہیں کمال کی بات یہ ہے کہ اُن کے اس طرزِ عمل پر ان کی بیگم صاحبہ کو بھی اعتراض نہیں ہوتا، مثلاً اب اشفاق احمد کو ہی دیکھ لیں، جب اس کا دل نوشی گیلانی سے ملنے کے لیے تڑپتا ہے تو یہ فوری طور پر سعود عثمانی کے گال پٹنے لگتا ہے کہ تل تو اِدھر بھی ہے جب اُسے اورینٹل کالج کی کسی خوب رو صاف و شفاف حسینہ کی یاد آتی ہے تو یہ فوراً جمیل احمد عدیل سے مل لیتا ہے۔

اگر کسی قدرے دراز قد برقعہ پوش خوبصورت فلمی قسم کی ہیروئن سے ملنے کو دل چاہے تو یہ نجیب جمال سے چھیڑ ڈال لیتا ہے۔ اور کسی سے ملنے کو دل نہ چاہے تو یہ غفور شاہ قاسم سے مل لیتا ہے۔

ایف سی کالج کی کسی راہداری میں چلتا ہوا آرہا ہو تو لگتا ہے مولا جٹ نے بھنگ پی لی ہو، اس حالت میں اس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی قریب آئے گا اور پن کی نوک آپ پر رکھ کر قدرے بلند آواز میں کہنے لگا، جو کچھ میری اگلی جیباں وچ ہے کڈ، بندہ مجبوراً اس کے ڈرانے پر اس کی تلاشی لے کر کہے گا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ نہیں نکلا تو یہ قہقہہ با انداز ہی ہی ہی، مار کر کہے گا، لوتے فیر جو کچھ تہاڈے کول اے، میری پچھلی جیب وچ پا دیو' اشفاق ورک ہمیشہ پینٹ کی پچھلی جیب میں کرنسی رکھتا ہے، اسی لیے جب یہ گاڑی میں بیٹھا ہو تو چوک میں لگے اشارے پر فقیر کو کچھ دینے کی نیت ضرور کرتا ہے، پھر اِدھر اُدھر ہل ہلا کر زور لگا کر جیب سے دس کا نکال کر سیدھا کرتا ہے اور اتنی دیر تک سیدھا کرتا ہے کہ اشارہ کھل جاتا اور یہ اوہو کہہ کر پھر بڑی تکلیف سے مل ہلا کر نوٹ جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اگلے اشارے پر پھر بھی یہی عمل دہراتا ہے، یوں مسلسل عمل

دہراہٹ کے ساتھ ہی اس کا گھر آ جاتا ہے، اور یہ گاڑی سے اُتر کر جیب سے دس کا نوٹ نکالتا ہے اس کو سیدھا کرتا ہے، پھر قائداعظم کی تصویر کا بوسہ لے کر نوٹ واپس جیب میں رکھ لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ لودسو شاعر تو زیادہ وڈھا غریب کون اے، تے میں تے آپ شاعر آں۔

پھر یہ اپنے ہمہ صفات آرام خانے میں داخل ہو جاتا ہے، یہ اپنے گھر کا تالا بھی یوں کھولتا ہے، جیسے کوئی چور ہو، اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر چابی لگا کر، پورے زور سے گردن پیچھے موڑ کر یکدم دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے، پھر لمحہ بھر بعد گردن نکال کر ساتھ آنے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے حالات ٹھیک نہیں تسی وی جاؤ فیر ملاقات ہووے گی۔

اشفاق احمد ورک نے گاڑی رکھی ہوئی ہے مگر کام کاج کے حوالے سے اس کو جب کہیں قریب جانا ہو تو یہ اُوبر کرواتا ہے، اور جب کہیں دور جانا ہو تب بھی سوچ سمجھ کر اُوبر ہی کرواتا ہے، اور اپنی گاڑی کی پشت پر ہاتھ رکھ کہتا ہے لو جی اج فیر تہاڈی بچت ہوگئی، عیش کرو، یہ گاڑی کی پشت پر ہاتھ اس لیے رکھتا ہے کہ اس کا ہاتھ گاڑی کی چھت تک نہیں جاتا، اگر ہاتھ چلا بھی جائے تو ہاتھ پھیرا نہیں جاتا" کہ اس عمل کے لیے اس کو پنجوں کے بل کھڑا ہونا پڑتا ہے، اور یہ پنجوں کے بل کھڑا ہونے کا عادی نہیں ہے۔ سیدھے سبھاؤ کام کرتا ہے اور اپنے پیروں پر چلتا پھرتا ہے یہ چل رہا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ایک سال کا بچہ چلنا سیکھ رہا ہو،

اشفاق احمد ورک، ایک مکمل دیہاتی پس منظر رکھنے والا، شہری بابو ہے، جوز بردستی خود کو لاہوری شہری، بنانے کی کوشش نہیں کرتا، آج بھی اس کے اندر دیہی پنجاب بسا ہوا ہے، اس کی پنجابی نظمیں بتاتی ہیں کہ یہ بابو شابو کوئی نہیں سیدھا سادھا سچا اور کھرا پاکستانی اور دیہاتی ہے اسی لیے یہ ہمارے 90 فیصد لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اشفاق احمد ورک اگر صرف اشفاق احمد ہوتا تو یقیناً اس کو بھی ایک بانو قدسیہ کی ضرورت ہوتی، اس ضرورت کو کم کرنے کے لیے ہی اس نے باقاعدہ بڑی محنت سے خود کو ورک بنایا ہے، ویسے اگر یہ ورک نہ بھی ہوتا اور صرف اشفاق احمد ہی ہوتا تب بھی ہم جمیل احمد عدیل کو اس کی بانو قدسیہ ہی سمجھتے۔

اس نے اپنے مجموعہ کلام مجال میں لکھا ہے کہ میرے دوستوں کا مشورہ تھا کہ میں اس شاعری کا انتخاب کرلوں یا کروالوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

اشفاق احمد ورک جانتا ہے کہ ایک بار علی اکبر عباس نے اپنی شاعری کا انتخاب ڈاکٹر ضیا الحسن اور ڈاکٹر امجد طفیل سے کروایا تھا، جب یہ انتخاب مکمل ہو گیا تو علی اکبر عباس نے انتخاب سائٹ پر رکھا اور باقی کلام چھاپ دیا، بس یہ بات سوچ کر اشفاق ورک نے اپنا انتخاب نہیں کروایا، جو تھا جیسا

تھا، شائع کر دیا، اشفاق احمد ورک کا آرام خانہ ظرافت منزل ایک خوبصورت پُرسکون، اور تخلیقی مقام ہے، جہاں آئے گئے کے ساتھ پکے قدیمی مسلمانوں والا سلوک کیا جاتا ہے، ہر شے محبت کی ٹرے میں رکھی ہوئی آتی ہے کھانے پینے کے ساتھ یہاں مہمان کو یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے بیٹھے اُٹھے لیٹے، ایک بار میں اس کے گھر گیا، بیل دی، تو اس نے دروازے کھولا، بہت محبت سے اوہو کہہ کر ملا، اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مخاطب ہوا آؤ آؤ، پھر ڈرائنگ روم میں لایا اور پھر مخاطب ہوا، رضوی صاحب تسی پیر سیدھے کرو میں تیل پھڑ لے آواں۔

اس وقت یہ نہا کر نکالا تھا اور شرعی حدودوں پر تولیہ لپٹا کر پھر رہا تھا، مجھے تیل کا کہہ کر خود اندر چلا گیا، پھر واپس آیا، اور مخاطب ہوا یار بڑی جلدی اے، تسی دسو کی حال اے، میں نے پھر کہا ٹھیک ہوں یہ پھر اندر چلا گیا واپسی پر ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے پھر آیا اور مخاطب ہوا تسی پیر سدھے کرلو، میں نے کہا میں ٹھیک آں تو اس نے مجبوراً تیل سر پر لگا لیا۔ اور جو بچا وہ ہتھیلیوں پر اچھی طرح مل کر چہرے پر رگڑ لیا۔ ہتھیلیوں کو بار بار چہرے پر ملنا اس کی عادت ہے۔ اس طرح یہ ایک تو اپنی سُستی اتارتا ہے دوسرے جلد کے اندر کی سرخی اُبھارتا ہے۔ تاکہ ایف سی کالج کے قدیمی کولی ڈور میں بیٹھی نازک اندام حسینائیں اس کو سرخا سمجھیں۔ اور بے خوف ہو کر استراحت فرماتی رہیں۔

اس کو ادبی تقریبات سے چڑ ہے مگر جہاں صدر یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے جانا پڑے تو چلا جاتا ہے مگر بور ہی ہوتا ہے اور اس وقت تک ہشاش بشاش نہیں ہوتا، جب تک اشفاق احمد ورک کی تحریر نہ سن لے۔

یہ فطرتاً نفیس طبیعت کا مالک ہے اس لیے شیخوپورہ میں رہتے ہوئے بھی کبھی ہرن مینار پر نہیں چڑھا۔ نہ ہی کبھی شہزادہ بنا، اسی طرح جب یہ لاہور آیا تو شاہی قلعہ میں بیٹھ کر کوئی شاہی فرمان جاری نہیں کیا، اس نے اپنے فطری طے شدہ پروگرام کے تحت بادشاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر خیر کی اذان دی، کہ یہ خیر کی اذان ہی اشفاق احمد ورک کا مزاج ہے کہ یہ خیر کی اذان ہی اس کا کالم ہے یہ خیر کی اذان ہی اس کی شاعری ہے۔

اور اب یہ خود آپ کے سامنے ہے آپ کا کام ہے کہ آگے بڑھیں، اس کو غور سے دیکھیں اور یقین کرلیں کے بڑے کام کرنے والے بڑے لوگ بلکل اشفاق احمد ورک کی طرح ہوتے ہیں، کہ یہ ہمیشہ دانائی اور بینائی میں اضافہ کرتے ہیں اور نظر کو کبھی دھوکا نہیں دیتے کہ یہ تو نظروں کا تحفہ ہوتے ہیں، سو قدرت کی طرف سے عطا کردہ طنز و مزاح کا یہ انمول تحفہ اُردو ادب کے قارئین کو مبارک ہو۔

☆☆☆☆☆

سنو ابلیس کے بیٹو!

سنو ابلیس کے بیٹو!
کسی فرعون کی شہ پر
ریاضِ جودت وتہذیب کے
اونچے شجر
اور کم سِن ومعصوم پودے
کاٹ سکتے ہو
جلا سکتے ہو
بلڈوزر چلا سکتے ہو
اور بھاری بموں سے
امن وحسن وخیر کے
پرچم اڑاتی،
ہنستی گاتی بستیاں
کھنڈر بنا سکتے ہو
لیکن!
یاد رکھو
اِس تمہاری
وحشیانہ بربریت سے
چٹانوں کا بھی سینہ چیر کر
پیہم ابھرتی
سرکشیدہ زندگی،
پندار کی روئیدگی،
شبھ سوچ کی تابندگی
عالی حشم آئندگی
روکی نہ جائے گی
یہ اک دن
اپنے پاؤں پر
تمہارے سر جھکائے گی
سرِ دیوارِ روز وشب
نئے نقشے بنائے گی

جلیل عالی

حرفِ دعا

بتاؤ کہ ہم کس عدالت کا در کھٹکھٹائیں
ہمیں اب کسی پر بھروسہ نہیں ہے
کہ اب عدل و انصاف مانگے سے ملتا نہیں ہے
غضب ہے کہ ہم آتشِ بے سبب میں جلائے گئے ہیں
پرانی شکستوں کا بدلہ چکانے کا فتنہ اٹھایا گیا ہے
کہ پھر مرحبِ وقت خیبر پہ پرچم کشا ہے
مگر کس کے سینے میں دل ہے جو گم گشتہ
اوراقِ تاریخ پڑھنے کی خواہش کرے گا
کہ ہم خود بھی اپنی اکائی کو خانوں میں
تقسیم کرنے پہ راضی ہوئے ہیں
ادھر غیر چاہے کہ ہم بے نشاں ہوں
تعصب کا آتش فشاں پھٹ پڑے
اور لاوا کراں تا کراں پھیل جائے
اسی لمحۂ جاں گسل میں
فقط ایک حرفِ دعا ہے زباں پر
کہ ہم زندگی چاہتے ہیں
کہ ہم بے زباں، بے اماں اب نہیں ہیں
ہمارا بھروسہ خدا پر رہے گا
وہی جسم و جاں کی حفاظت کرے گا

حسن عسکری کاظمی

فلسطینی بچوں کے لیے ایک نظم

تمہاری اب آ گئی محاذوں پہ باری بچو!
تمہارے باپوں کو ہے ضرورت تمہاری بچو!

بنا ہے میدان جنگ پورا علاقہ اپنا
گھروں کے اندر لڑائی ہے آج جاری بچو!

بچھے ہیں اندوہناک یوں حادثے گھروں میں
ہیں صحن و دالان موت کی راہداری بچو!

نشانہ اس نے لیا ہُوا ہے ہمارے سر کا
نہیں فضا میں غنیم کی چاند ماری بچو!

کسی پرانے معاہدے میں ہیں بک چکے ہم
نہیں ہیں اب اپنے سانس بھی اختیاری بچو!

صفوں میں اپنی گماں حریفوں کا ہو رہا ہے
فضا میں یوں رچ گئی ہے بے اعتباری بچو!

بگڑ چکا ہے توازن اپنی حیات کا اب
جو ہو رہا ہے وہ کام ہے اضطراری بچو!

بھریں گے رنگ اپنے عزم کا ان تباہیوں میں
لہو سے اپنے کریں گے اب آبیاری بچو!

اِسی کھنڈر پر کھڑی کریں گے عمارتِ نو
کہ ہو گا جب ختم موسم گریۂ زاری بچو!

ہمیں سنبھلنا ہے اپنی اَقدار کے بھروسے
نحیف ہونے کی کیسے ہو شرمساری بچو!

نہ گرنے پائے علم جواں زاد حوصلوں کا
حفاظت اِس کی ہے اپنی اب ذمہ داری بچو!

چکائے گی قرض اپنا ہر آتی نسل، ہشیار
رہے گی یہ اپنی فتح تک جنگ جاری بچو!

ریاض مجید

سفید ہاتھی

ہماری محنت پہ کتنی صدیوں سے پل رہے ہیں سفید ہاتھی
ڈھلی ہے مستی میں مفت خوری مچل رہے ہیں سفید ہاتھی

کرے گی یلغار دشمنوں پر نہ فوج پورس کے ہاتھیوں کی
پلٹ کے اپنے محافظوں کو کچل رہے ہیں سفید ہاتھی

نہیں انھیں علم سبز فصلیں ہمارے آئندہ کی امیں ہیں
مہیب قدموں میں خواب کیا کیا مسل رہے ہیں سفید ہاتھی

کبھی نہ بدلا رویہ ان کا مگر ہمارے دماغ دیکھیں
ہمیں یہ رہتی ہے خوش گمانی بدل رہے ہیں سفید ہاتھی

ہماری نسلوں کو بھوک افلاس مار ڈالے انہیں ہو غم کیا
کمی نہیں ان کے رزق میں پھول پھل رہے ہیں سفید ہاتھی

ستم شعاری سے باز آ کر اگر جتائیں خلوص تم سے
یہی سمجھنا تھکے ہوئے ہیں سنبھل رہے ہیں سفید ہاتھی

کسی کو ہوتا نہیں بھروسہ کہ بکنے والے ہیں ساتھ کس کے
کسی کو کیا علم کس اشارے پہ چل رہے ہیں سفید ہاتھی

مہاوتوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی دیکھنا ہے
گرے ہوئے ہیں سوار نیچے اچھل رہے ہیں سفید ہاتھی

وہی شبِ تار ہے مسلط وہی ہیں محرومیاں ہماری
سروں سے کالی بلا ٹلی ہے نہ ٹل رہے ہیں سفید ہاتھی

قریب تر ہے وہ دن ہمارے لیے نہ باقی رہے گا کچھ بھی
سبھی وسائل کو رفتہ رفتہ نگل رہے ہیں سفید ہاتھی

کسی طرح داغ اپنی ہستی پہ لگنے دیتے نہیں یہ شاطر
ہر اک سیاہی ہمارے چہروں پہ مل رہے ہیں سفید ہاتھی

بھلا چکے ہیں یہ شاہزادی کے آب و دانہ کی لذتوں کو
اب اور ہی شاہ کے کرم سے بہل رہے ہیں سفید ہاتھی

نہ کام کے ہیں نہ کاج کے ہیں فقط یہ دشمن اناج کے ہیں
سوار ہیں ہم پہ کب سواری میں ڈھل رہے ہیں سفید ہاتھی

ابھی تو ہے ان کے پاؤں میں سب کا پاؤں ان کے قدم جمے ہیں
خبر نہیں ہم یہ کب سنیں گے پھسل رہے ہیں سفید ہاتھی

اگرچہ ہم ہیں بہت ہی صابر مگر ہے برداشت آج مشکل
نہیں ہمارا قصور ہم کو جو کھل رہے ہیں سفید ہاتھی

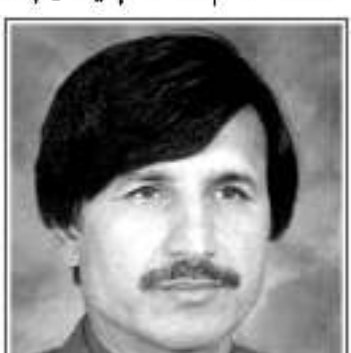

گلزار بخاری

زندگی سے خالی ہوتا بدن

فلک تک جانے والی سیڑھی تھامے
کوئی مخلوق میرے دائیں بائیں گھومتی ہے
سرھانے آ کھڑی ہوتی ہے
کہتی ہے:
تمھارے نام کا پیغام آیا ہے
اُٹھو رختِ سفر باندھو
ہمارے ساتھ چلنا ہے تمھیں---

تب سے مرے پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر
سر کے بالوں تک
عجب اِک سنسنی پھیلی ہُوئی ہے
رگوں میں دھیرے دھیرے منجمد ہوتا لہو
ساکت کیے دیتا ہے ہر عضوِ بدن کو
کہیں آنکھوں کی پُتلی میں
بس اِک دو ساعتوں کی زندگانی رہ گئی ہے
بھرے بازار کی خالی کہانی رہ گئی ہے!

خاور اعجاز

آگ اور خون

[سانحہ آرمی پبلک سکول کے تناظر میں]

یہ دسمبر عجب دسمبر تھا
آگ اور خون کا جھمیلا تھا

رنج و غم کے مہیب سایوں میں
اک قیامت بھی ساتھ لایا تھا

اب دسمبر بھی جا رہا ہے وہاں
جس جگہ سے کوئی نہیں لوٹا

اس دسمبر میں ہم نے کیا کھویا
اس دسمبر میں ہم نے کیا پایا!

مسکراتا چمن جلایا گیا
پھول کلیوں کا خوں بہایا گیا

ذکر اس کا نہ کوئی دہرائے
اس کا ناگفتہ ہی رکھا جائے

پیارے پیارے حسیں شگوفوں کو
نودمیدہ مہکتے پھولوں کو

آگ اور خون میں نہایا گیا
ایک کہرام سا مچایا گیا

جان جاتی ہے یاد کرتے ہوئے
ٹیس اُٹھتی ہے آہ بھرتے ہوئے

کس قدر دل خراش منظر تھا
کیا کہیں بس یہی مقدر تھا

پھر دسمبر نہ لوٹ آئے کہیں
بس یہی خوف کھائے جاتا ہے

سید افسر ساجد

سفر

کس سے کہیں کہ ہم کسی
ساعتِ بے امان میں

اُن سے تو بے خبر ہی تھے
خود سے بھی بے خبر رہے

دل کا کوئی معاملہ
اب تک نہ صاف ہو سکا

کہنے کو کیا رہا یہاں
بات کہاں چلی گئی

کون کسی کے ساتھ تھا
ہم کو نہ کچھ پتہ چلا

رختِ سفر کے بوجھ سے
گرد و غبار راہ میں

کس سے کریں شکایتیں
کس کو بتائیں کیا ہوا؟

ارحم

ارحم!
میرے گھر کے باغیچے کا پہلا پھول
آمدِ موسمِ گُل کا اِشاریہ
نِکہتِ جاریہ
سو جائے تو بادِ بہاری خرام کرے
جاگے، تو بالیں پہ سحر کلام کرے
اِٹھلائے تو چھا جائے ہر سمت بہار
چلے، تو مور بھی رقص کریں دیوانہ وار
بولے، تو اُڑتے پنچھی یک دَم رُک جائیں
ہنسے، تو روشن آنکھیں بھی ہنسنے لگ جائیں

مری دعاؤں،
آرزوؤں،
لفظوں پر اُس کا راج رہے گا
شہرِ محبت میں اُس کے سَر، تاج رہے گا

وہ مجھ سے،
میں، اُس سے،
جنم جنم سے یوں وابستہ ہوں
جیسے وہ میری پہچان ہے
جیسے اُس طوطے میں ہی بس
میری جان ہے، جانِ انیس!

محمد انیس انصاری

نم زدہ راستوں پر

مری عمر کے کچھ برس
زندگی کے شجر پر
تروتازہ پتوں کی صورت
خوشی اور غمی کی طراوت بھری اوس میں بھیگتے تھے
نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں
ابھی تو یہیں تھے
حوادث کی منہ زور بارش ہوئی تھی
یہ گیلے ہوئے
اور آندھی نے شاخِ حیاتِ رواں سے چھڑایا
ہواؤں کے ہم راہ اپنے ٹھکانے سے باہر
کہیں جا گرے ہیں
اداسی انھیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے
اسی کوٹھڑی میں
جو ساون کی رُت میں
کبھی خشک ہوتی نہیں تھی
ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے
اندھیرے کی سیلن میں مہکی ہوئی سیڑھیوں میں
درختوں کے سایوں میں سوئے ہوئے نم
زدہ راستوں پر
پُرانے خطوں، کاغذوں میں بسی بسکٹی
خوش بوؤں کی نمی میں
کہیں بھیگے بھیگے کواڑوں کی درزوں کے اندر
کہیں بوندا باندی کے پہلو میں
گیلی رسوئی میں
آنکھوں میں چبھتے دھوئیں میں
اداسی انھیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے
اگر مل سکیں تو!

طالب انصاری

نظم

بدل گئے ہو
بدل گئے ہو
تمہارے اطوار
کب سے تبدیل ہو گئے ہیں
تمہارے معیار
کب سے تبدیل ہو گئے ہیں
ہمارے جیسے تمہاری نظروں میں
اب حقیقت میں جچتے کب ہیں
نئے زمانے کے رکھ رکھاؤ
وہ دنیا والے تمہارے ڈھب ہیں
چلو یہ اچھا ہوا
محبت کی ابتدا میں
سنبھل گئے ہو
بدل گئے ہو
چلو یہ اچھا ہوا کہ تم نے
بھلا دیا ہے
رفاقتوں کا ہر ایک لمحہ
مذاق لگتا ہے تم کو سب کچھ
تو اتنا کہنا ہے آج تم سے
کہ میرے دل نکل گئے ہو
اگر تم اتنے بدل گئے ہو

افتخار شوکت

شہیدِ ملت کی نذر

کیسے کمال دن تھے
جب میں قلم کو تھامے
اک نظم لکھ رہی تھی
اس نظم میں تھا گونجا
آزاد مملکت کی
بے خوف سلطنت کا
اک جاں فزا ترانہ
میرے قلم نے ایسے کتنے پڑاو لکھے
جن میں رکے ہوئے تھے
تہمت زدہ ڈوپٹے
نوحے بھرے فسانے
قائد چلے گئے تھے
امید کی مگر اک
ایسی کلی کھلی تھی
پرچم میں آبسی تھی
لیکن بہت اچانک
قائد کا سیدھا بازو
اندر کے دشمنوں نے
جلسے میں کاٹ ڈالا
مارا گیا وہ لیڈر
جو آخری نشانی قائد کی رہ گیا تھا
حالانکہ خوف مکا
جس نے بغیر حملہ
دشمن کی بیرکوں کو
اندر سے پیس ڈالا
غیرت کا معجزہ تھا
سارے عدو تھے سہمے
ملت کے پاس کیا تھا
ہتھیار خود نہتے
قسمت سے ان دنوں میں
راہداری_ سیاست تھوڑی سی باحیا تھی
قائد کے ہم نوا کو ملت شہید کہہ کر
سڑکوں کے نام ان کی عظمت کے نام رکھ کر
اونچی عمارتوں کو موسوم کر کے ان سے
اس خان خان زادہ کا نام یاد رکھا
پر نظم میری چپ ہے
ہر پل یہ سوچتی ہے
قاتل کہاں ہیں ان کے
پہلا وزیر اعظم جو ہم سے کھو گیا ہے
مرقد میں پوچھتا ہے
ظالم کہاں گیے ہیں
قبروں میں چھپ گیے ہیں؟
یا خفیہ ایجنسی
میرا سراغ لیتے
کیا خود بھی مر گئی ہے؟

فرخندہ شمیم

چاول کا اِک دانہ

اپنی چاپ سے ڈرتی آنکھیں
پنکھ سمیٹے
چپکے چپکے پوچھ رہی تھیں
آ جاؤں میں گھر کے اندر
آنگن میں میلے برتن سے
اِک انمول خزانہ لینے
میں نے سانسیں روکے رکھیں
ننھی چڑیا در تک آئی
چاول کا اِک دانہ لینے

رخشندہ نوید

ذرا سا گھر بڑا لے لو

ذرا سا گھر بڑا لے لو
خبر کچھ بھی نہیں ہوتی
کسی انجان ساعت کی
خدانخواستہ گر یونہی اک دن
میں گزر جاؤں جہاں سے
تو اتنے لوگ اتنے سارے لوگ
اس صحن میں کیسے سمائیں گے
پتہ میرا کہیں سے پوچھتے
سب مرد و زن

پیر و جواں
شناسا اجنبی چہرے
مرے بچپن سے لے کر آج تک کے
دوستوں کی ٹولیاں، ہمجولیاں
مرے کچھ ملنے والے
اور مرے کچھ جاننے والے
ہزاروں چاہنے والے
سبھی آنا تو چاہیں گے
کسی سے مختصر ہو یا کہ دیرینہ
وہ رشتہ تو نباہیں گے
سبھی آنا تو آنا چاہیں گے
ذرا سا گھر بڑا لے لو
یہ میری زندگی سے منسلک اِک
آخری تقریب ہوگی

اب اس کے واسطے اک ہال تو بک ہو نہیں سکتا
ذرا سا گھر بڑا لے لو

ناسٹیلجیا

سب چھتوں، آنگنوں اور ماؤں کے مابین
اک سانجھ تھی
اور ہمسائے کی بیٹیاں بھی تھیں
ماں جائیوں کی طرح
خیر وخوبی، بھلائی کی پہچان تھی
ساری بستی ہی اِک دوسرے کی مددگار و نگران تھی
باجرے کی، مکئی کی، گندم کی فصلوں پہ
سب کا اجارہ تھا
ہر فصل کی باس اپنی کہانی سُنانے کی دھن میں مگن
چاندنی رات میں سن رسیدہ بزرگوں کی
محفل میں دانش کے موتی لٹاتی
وہ ہیر اور سیف الملوک اور یوسف زلیخا کی تانیں
دلوں اور خوابیدہ جذبوں کا جھولا جھلاتی
محبت کی سرگوشیاں
پہلی ساون سے پہلے ہی پیپل پہ رنگوں کے میلے میں
احساس کی ڈور تھامے، بہت دور جانا
وہ تتلی کے رنگیں پروں، جگنوؤں کے تعاقب
میں ہجولیوں سنگ کھیتوں کی مینڈھوں پہ پھرنا
بوقتِ سحر لحنِ داؤدی میں وہ اَذاں کی صدا
(چاچا وارث کی آواز سن کر جہاں جاگتا تھا)
مدھانی کی آواز، لسّی میں غوطے لگاتے
وہ مکھن کے پیڑے
سرِ شام اپنے گھروں کو پلٹتے، تھکے ماندے ریوڑ
وہ چرواہے کی بانسری میں مچلتے سُروں کا خزانہ
ابھی تک نگاہوں کے، یادوں کے البم میں ہے
اُن دنوں ساری بستی کا اِک اور ہی طور تھا
وہ بھی کیا دور تھا

تابش کمال

تُو اور مَیں

یاد کا بنا ہُوا تُو
ہجر میں بسا ہُوا میں
خون میں رچا ہُوا تُو
زخم سے رِسا ہُوا میں
درد میں بندھا ہُوا تُو
گرد میں اَٹا ہُوا میں
شعر میں گُھلا ہُوا تُو
شوق میں جڑا ہُوا میں
چاک پر رُکا ہُوا تُو
خاک میں مِلا ہوا میں
خواب میں سجا ہُوا تُو
عشق میں مِٹا ہُوا میں

محمد سلیم ساگر

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ایک عادت ہے عبادت خالد
کچھ تو پُوجیں گی پجاری آنکھیں

ماں

اِک پیکرِ ایثار و محبت تھی مری ماں
میرے لیے دُنیا میں ہی جنت تھی مری ماں

اِک پل کو بھی رونے نہیں دیتی تھی مجھے وہ
ہر حال میں اِک میری ضرورت تھی مری ماں

بچوں کے سروں پر تھی وہ اِک سائے کی صورت
ہر حال میں پابندِ شریعت تھی مری ماں

ہر غم سے میں آزاد تھا ہوتے ہوئے اُس کے
میرے لیے تو تحفۂ قدرت تھی مری ماں

آنسو مرے اب پوچھنے والا نہیں کوئی
میرے لیے اِک عزم کی دولت تھی مری ماں

بچپن مرا پھولا پھلا آغوش میں اُس کی
تسکیں کی ردا باعثِ فرحت تھی مری ماں

جب تک رہی میں دور رہا رنج و الم سے
میں کہتا ہوں خوشیوں کی علامت تھی مری ماں

یادوں میں مری عابدی روشن ہے وہ پیکر
میرے لیے خوشیوں کی ضمانت تھی مری ماں

علی حسین عابدی

فلسطین

توبہ توبہ کر اُٹھی خلقِ خدا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

خون میں ڈوبے ہوئے ہیں شیر خوار غمزدہ پیر و جواں ہیں اَشک بار
حشر ساماں ہیں یہاں لیل و نہار دَب گئی بارود میں چیخ و پکار

ہر نظر یہ کہہ رہی ہے برملا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

شُعلہ شُعلہ وادیوں کے درمیاں اَب فلسطینی کھڑے ہیں بے اَماں
اُن کے سَر پَر چھت ہے اَب نہ سائباں ایک ہوں گے کب حرم کے پاسباں

ہر طرف پہرہ لگا ہے موت کا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

بَن گئی ہیں وادیاں ملبے کا ڈھیر ماہ و انجم بُجھ گئے چھایا اَندھیر
پھر بھی پُر اُمید ہیں اللہ کے شیر رات کے پہلو سے پُھوٹے گی سویر

سایہ لَرزاں ہے شبِ دیجُور کا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

جائے کیا فریاد اللہ کے حضور اَب کوئی موسیٰ ہی ملتا ہے نہ طُور
جَلد ہو اے کاش مہندی کا ظہور خاک میں مِل جائے ظالم کا غرور

غمزدہ ہے جس کی حالت پر قضا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

بر سرِ پیکار غازی کُو بکُو　　سُن رہے ہیں بے بسوں کی ہاؤ ہُو
مُلک و مِلّت کو کریں گے سُرخرو　　"رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو"

چار سُو ہے ایک دریا آگ کا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

آسماں سے کب فرشتے آئیں گے　　جو بدر کی داستاں دُہرائیں گے
اَمن کے اَنوار جو برسائیں گے　　فتح و نصرت کے علم لہرائیں گے

بَربَریّت کی ہوئی ہے اِنتہا
یہ فلسطیں ہے کہ دشتِ کربلا

اکرم سحر فارانی

نظم

[نیّر سرحدی کے لیے]

نیّر ہے نام شعر و سخن کے جہان میں
روشن ہو جیسے چاند کوئی آسمان میں

تخلیق کر رہے ہیں فسانے حیات کے
افشا وہ راز کرنے چلے کائنات کے

وہ تو نقیبِ محفلِ میلاد و نعت ہے
تعریفِ مصطفیٰؐ میں مگن اُس کی ذات ہے

اجداد اُن کے شعر و سخن سے قریب تھے
کتنے تھے اعلیٰ ذوق بڑے خوش نصیب تھے

اجداد میں تو کوکب و آزاد نام ہے
ہر ایک دل میں اُن کا بڑا احترام ہے

کلیاں بھی شاعروں کے دلوں کی وہیں کھلیں
اُن کے مشاعروں میں بڑی رونقیں ملیں

یہ شہر اب تو چھوڑ دیا فاختاؤں نے
پرچم نہ اب یہاں نظر آئیں گے امن کے

ریاض ندیم نیازی

..... یہ کھیل ہے

یہ وقت اور نصیب کا
جو ایک تال میل ہے
یہ کھیل ہے

کسی کے پاس کچھ نہیں کہ سانس بھی خرید لے
کسی کو ایک Mall پر خریدنے کے واسطے
پسند کا Brand مل نہیں رہا
دل بہل نہیں رہا
بھلے ریال، درہم و روپے کی ریل پیل ہے
یہ کھیل ہے

وہ جس کے پاؤں تخت پر تھے کل تلک
آج ہی یہ فیصلے میں لکھ دیا گیا ہے
اس کو جیل ہے
یہ کھیل ہے

بدل لیا کسی نے حسبِ آرزو نسب
ملے جو اچھے روز و شب
تو اس نے ایک دن کہا؛
نہیں ہے کوئی ایشور، بدھا، رسول یا خدا
اسی کو لگ رہا ہے اب
جو آسماں ہے
آسماں نہیں ہے یہ غبار ہے

شعور کی جب آخری بلندیوں کو چھو لیا
تو ایک دن نجانے اس کو کیا ہوا
کہ پاگلوں سے جا ملا
اور کہا؛
خیال اور خیال کے کمال تک
شعور کا جو دل میں اک غرور تھا
حقیقتاً فتور تھا
ہے کوئی جو خرید لے
شعور فارسیل ہے
یہ کھیل ہے

صغیر احمد صغیر

شہرِ آشوب

[غزہ کے دل دوز اور چشم کشا حالات کے پس منظر میں]

کسی دن سو کے جب اٹھے گی دنیا
کسے معلوم کیا دیکھے گی دنیا

ابھی تک آگ ہے میرے ہی گھر تک
ابھی کچھ دیر میں جاگے گی دنیا

ابھی محوِ تماشا ہے زمانہ
ہمارے بعد تو سوچے گی دنیا

مٹائے جا رہے ہیں جس طرح ہم
یقیناً یاد تو رکھے گی دنیا

حقیقت سے فسانہ بن رہے ہیں
کتابوں میں ہمیں ڈھونڈے گی دنیا

قیامت کے بھروسے پر نہ رہیو
بہت کچھ اور بھی دیکھے گی دنیا

فضاؤں میں تعفن ہے بلا کا
ہمارے خون سے مہکے گی دنیا

کبھی تو کام آئے گا یہ گریہ
کبھی تو نیند سے جاگے گی دنیا

عملدار حسین

......"گُرو"......

ہمارے ڈیرے پہ آؤ صاحب
تمہیں دکھائیں
ادھورے لوگوں کی پوری دنیا
کھنکتے گھنگروؤں کی لَے پہ رقصاں ٹرانس جینڈر
جو اپنے سینے سے جنسی ردوبدل کے دکھ کو
لگائے اپنی سیاہ بختی سے لڑ رہے ہیں
یہ پارساؤں کی پارسائی کا راز رکھتے ہوئے مخنث
عمیق راتوں میں پلتے لمحوں کو اپنا ملبوس کر رہے ہیں
کہ روحِ کامل کے نامکمل بدن کے دکھ کو
قدیم وقتوں سے سہہ رہے ہیں
یہ سب صحیفوں میں ذکر اپنا تلاش کر کر کے تھک گئے ہیں
کسی صحیفے میں حوا آدم کی ہے کہانی
کہیں کتابوں میں ماں کی عظمت کی ہے نشانی
کہیں پڑھا تھا
"زمیں پہ اُس کا وجود ہوتا تو ایک ممتا کا روپ ہوتا"
ہمارے ڈیرے کو دیکھو صاحب
یہ ریتا، جُولی، یہ ڈولی، گُڑیا
کہ جن کے ماتھے پہ ماں کی ممتا کا ایک بوسہ تلک نہیں ہے
میں ان کو کیسے یقیں دلاؤں کہ ان کی ممتا خدا نہیں تھی
میں ان کو کیسے بتاؤں صاحب
کہ جن صحیفوں میں باپ جنت کا در لکھا ہے......
وہ حق ہے صاحب... مگر حقیقت ہے کڑوا سچ ہے کہ
ان کی جنت کے در پہ بچپن سے ایک تالا لگا ہوا ہے
کہ ان کی قسمت کی کوئی کھڑکی کھلی نہیں ہے
ہر اک پہ جالا لگا ہوا ہے!!!

عاطف جاوید عاطف

نظم

جس کا ڈر تھا کئی روز سے
اُٹھ کہ اب وہ گھڑی آ گئی

عشق میں جو بہت دور تھی
وہ تو منزل ابھی آ گئی

تھا اسی میں وہ مانوس گھر
یہ وہی تو گلی آ گئی

میں اندھیروں کا عادی ہوا
میرے گھر روشنی آ گئی

چر چکا بن کی کڑواہٹیں
گھاس آگے ہری آ گئی

دل لگی کرتے کرتے، مرے
سامنے عاشقی آ گئی

کیا کرو گے اگر راہ میں
روبرو ''وہ'' کبھی آ گئی

کیا کرو گے جو طوبیٰ تلے
دھوپ سر پر یہی آ گئی

اب سناں پر اُٹھا لو مجھے
سر کے نیچے اَنَی آ گئی

غلام مرتضیٰ

نثری نظم

لب کھولنے کی سزا
قید بامشقت ٹھہری ہے
سو
لوگوں نے لبوں پر قفل لگا لیا ہے
اور آنکھوں میں میخیں گاڑ کر
سماعتوں میں پگھلا سیسہ انڈیل دیا ہے

شہر بھر میں
زندہ لاشیں گھومتی ہیں

سنا ہے امن وامان کی صورتحال بہتر ہو گئی ہے
کیونکہ دہشت پھیلانے والے لوگ
عقوبت خانوں میں قید ہیں

خواب دیکھنے والی آنکھیں
اب کبھی خواب نہیں دیکھیں گی
قبروں پر نظریات کے کتبے لگے ہیں
سوچ فکر آدرش
اپنی موت آپ مر چکے ہیں

زندہ رہنے کے لئے
خوابوں کو پھندا لگانا ضروری تھا

خوف کا رقص جاری ہے
فضا کی گھٹن آنے والے طوفان کی آمد کا
پتا دیتی ہے
نگاہیں آسمان کی طرف لگی
کسی معجزے کی منتظر ہیں

مناجاتیں کرنے والے ہاتھ مناجات
کرنا بھول گئے ہیں
وقت کی گردش رک جائے تو
زندگی تھم جاتی ہے
لگتا ہے
تقدیر
وقت کے ہاتھ کھلونا ہے

نائلہ راٹھور

رپورٹ (نظم)

بوجھل قدموں سے گھر آئی
میں نے پوچھا
کیا ہوا؟
کچھ نہیں
پھر بھی
کچھ تو ہوا ہے
''رپورٹ آ گئی ہے''
پھر!
بیٹی ہے
اللہ کی دین ہے، کوئی بات نہیں
بات تو ہے نا!
کیا؟
تم نہیں سمجھو گے
یہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی
وقت گزرتا رہا
جس دن ایمن کا جنم ہوا
گھر میں صفِ ماتم بچھی تھی
سب کو بیٹے کی توقع تھی
یہ میرے اختیار میں تو نہیں
اللہ کی مرضی کے آگے
بس چلے! تو کسی گھر میں
بیٹی نہ جنمے
دیکھتے، دیکھتے
توقع کے اِس ناسور نے
پاک رشتے کو ایسا ڈسا کہ
کبھی نہ ٹوٹنے والا انمٹ رشتہ
کرچیاں ہو کر
بکھر گیا

وہ ننھی جان اب چار برس کی ہے
اُسی کے ساتھ رہتی ہے
جس کو اس کی پیدائش پر رنج تھا
جی میں آ جائے تو
ایک آدھ تصویر
وٹس ایپ کر دیتی ہے
گھنٹوں اُسے دیکھتا رہتا ہوں
مسلسل دیکھتے رہنے سے
پرانی ہو جاتی ہے
کل کے اخبار کی طرح

محسن خالد محسن

''تلاشِ گم گشتہ''

یہ تمنا کا لاوا پگھل کر رہے گا
وہ جو صدیوں سے میرے دلِ مضطرب میں دبا تھا
وہ آنکھوں کے رستے بہے گا
کہ بہنا ازل کو ابد سے ملاتا ہے
پر کوئی ملتا نہیں
کیا بچھڑنے کے امکان کو
میری تخاروں میں بونے کا مقصد یہی تھا
کہ میں تجھ سے دوری پہ
قریہ بہ قریہ بچھڑنے کا نوحہ کہوں

کیا کہوں کہ تو خاموشیوں کو بھی
سانسوں کے تاروں پہ بجتی ہوئی
دھن میں سنتا ہے
کیسا معمہ ہے، جو حل نہ ہونے کا سامان
میرے خیالوں کی
الماریوں میں سجاتا چلا جا رہا ہے
مجھ کو قیدی کرو
اور میری تلاطم میں بہتے سمندر کو
آواز دو،
تا کہ میں تیری وسعت کا اندازہ کرتا چلوں

آنکھ کی پتلیوں میں
ہمارے بچھڑنے پہ تالی بجاتے ہوئے
سب تماشائیوں کو بھی قیدی کرو
تا کہ وہ بھی تو جانے
اُس ان دیکھی قوت کا دُکھ
جو ہمیں ایک دوجے کو
دوری پہ مجبور کرتی ہے
پر وہ دکھائی نہیں دے رہی

کیا دکھاوا ضروری ہے؟
اس انبساطِ جہاں میں،
نہیں ہے اگر تو تصدق شعاری پہ معمور
ہم کو بتائیں،
زمینی کہاوت پہ خندہ زنی کرنے والے
بتائیں ہمیں
وہ جو موجود ہے پر دکھائی نہیں دے رہا ہے،
کہاں ہے؟

زاہد خان

کشتِ نصیب

وہ بے مہر نازشِ دست پاش
بھرے دانوں سے دامان کو
اترا جو شان سے میری کشتِ نصیب میں
تو جھلا کے کھینچ کے بازوِ تنومند کو
کیا مشتِ بستہ کو ایسے باز
پڑی جا کے مزرعے کے کنار مری نہاد
پھر بھی اٹھا وہیں سرو وار، ملی قبائے حسینِ برگ، کلاہِ گل
لرزاں رہی مگر اس دھڑک سے مری یہ جاں
نہ کہیں ادھر سے گزر کرے غنیمِ حریص

حدِ کشت میں نہ رہا سرِ دستار ور
وہ سلیلِ دہقاں ایک شتاب گر
لیے اپنی بیل جو دوش پر
چلا آیا تھا سبزۂ حد کو تراشنے
نہ رہا جو بس میں وفورِ جوشِ مزارعت
تو کسولے کے اک وار سے
مرے لخت لخت کیے خمیدہ قد و قلم
گرے شاخچے جا اُس طرف، اِدھر آ گری سبد ثمر
ملا خاک میں کسی کے شکم کا رزق ہائے!

غمِ ناگہاں وہ چھیڑ بادِ شمال کی
کہ کیا مرے قدِ سرو کو یوں جس نے خم

ذوالفقار شاذ

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

آگ تاپی عجب، عمر بھر، بے طلب
جل بجھے، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

ایک تمنا

ستاروں سے بھرا خواہشوں کا آسمان ہو جیسے

زندگی تیرے تصور کی طرح جوان ہو جیسے

دُکھ ادھورے ارمان کی نفی کرتے ہوئے

ہر لمحہ تیرے تصور میں بسر ہوتا ہے

میں ترے حُسن سے زیادہ تیری وفا کو چاہوں

کیا کہوں بزمِ یار میں آج اتنی تنہائی نظر آئی

کہکشاں رقص کرتی تیرے مدار میں جیسے

نگہبان ہوں تیرے ساتھ ہوں تیری ساتھی ہوں

کاش ہر لمحہ تیری قربت میں بسر ہو میرا

عائشہ احمد جاوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راہ راہ دیواریں ، گام گام بے گاریں
شہر سنگ میں کیونکر میں نے زندگی کی ہے

یہ ہے انداز کب بڑائی ہے

عمر کی ساتویں دہائی میں

سبزی کی وہ دکان سے اکثر

گاجریں بھی اٹھا کے بن پوچھے

بکری کے جیسے کھاتا جاتا ہے

سبز مرچیں بغیر پیسے کے

دھنیا بھی مفت مانگ لاتا ہے

پوچھتا تھوڑی کب بتاتا ہے

اس کا معمول عمر بھر کا یہ

اس کی عادت ہے کون بدلائے

اس کو عاصم یہ کون سمجھائے

عمر کی ساتویں دہائی تک

کیوں نہ معلوم ہو سکا اس کو

یہ ہے انداز جگ ہنسائی کا

یہ ہے انداز کب بڑائی کا

عاصم بخاری

نظم

درد تو درد ہے کچھ دیر میں ہی جائے گا
نقش اس کا کبھی ابھرے گا کبھی جائے گا
جیسے بارش کبھی رم جھم کبھی شدت سے پڑے
ایسے ہی یاد بھی مدھم کبھی بڑھ جاتی ہے
میرے ہونے کا پتا میرے سوا کس کو ہے
یہ پہیلی مجھے ہر روز ہی الجھاتی ہے
نیا موسم بھی مری رہ سے گزر جائے گا
اس کا بدلاؤ بھی کچھ دیر ہی کو بھائے گا

کون بنتا ہے دیا کس کے لیے کتنی دیر
آندھی آ لینے دو عقدہ بھی یہ کھل جائے گا

شائستہ رمضان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مَیں کَل کا آدمی ہُوں ، مجھے کَل پہ ٹال دے
اَے دن ! مجھے زوال کی حَد سے نکال دے

2023 کا دانش ور اینکر پرسن

تو اپنی کتابوں میں پھرتی ہوئی دیمک
کی دھمک سُن لیتا ہے
مگر روتے ہوئے بچوں کی آواز تجھے سنائی نہیں دیتی
تو سمندر کے طول و عرض میں پھرنے والوں سے
سمندری احوال پوچھتا ہے
مگر سمندر کی لہریں اسکی تہہ میں پڑی ہوئی کشتی
کشتی کے گرد گھومتی ہوئی شارک
تجھے پریشان نہیں کرتی
تو اپنی رنگین ٹائٹل کتابوں میں قطار اندر
قطار چلتی ہوئی
دیمک کے ترقیاتی منصوبوں سے آگاہ ہے
مگر تباہی کے مناظر تجھے نظر نہیں آتے
تو تباہی روکنے کے لیے کانفرنس بلاتا ہے،
تو اوروں کے خیالات سے اپنا فکری
ڈرائنگ روم سجاتا ہے
تو پیاسوں کو مشکیزہ دیتا ہے
اور پانی سے گاڑی واش کرتا ہے
تو پھل دار پیڑ کے ساتھ کتا باندھ کر خوش ہوتا ہے
پھل دار پیڑ سے کتا باندھنے والا
صبر قناعت دانش اور بہادری کے پھل سے محروم رہتا ہے

تجھے ایک آواز بدمست رکھتی ہے
تجھے دانشور کہنے والا
سرسراہٹ کیے بغیر اگلے دروازے پر جا چکا ہے
اور تو بدمست حالت میں
لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھا،
سرپٹ دوڑا جا رہا ہے

اعجاز رضوی

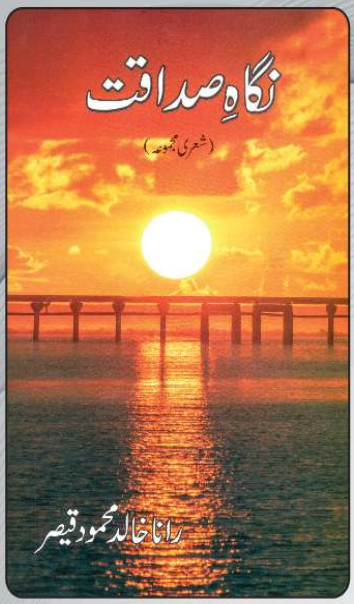
نگاہِ صداقت
(شعری مجموعہ)
رانا خالد محمود قیصر

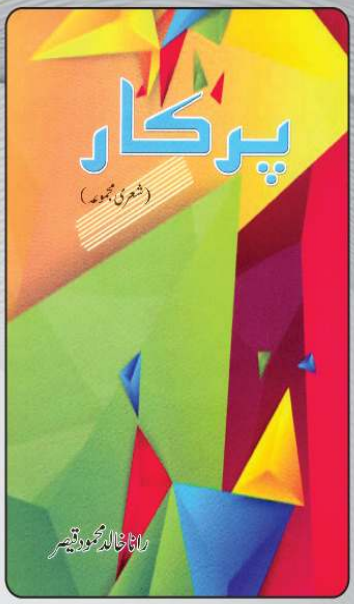
پرکار
(شعری مجموعہ)
رانا خالد محمود قیصر

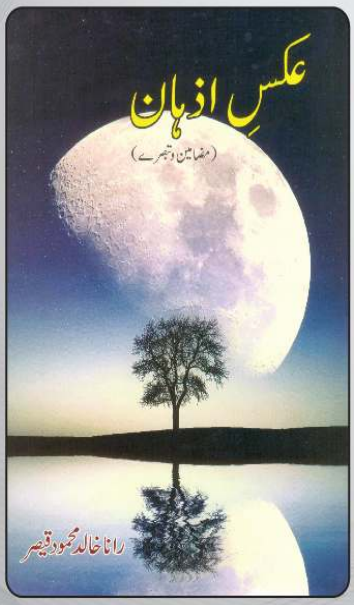
عکسِ اذہان
(مضامین و تبصرے)
رانا خالد محمود قیصر

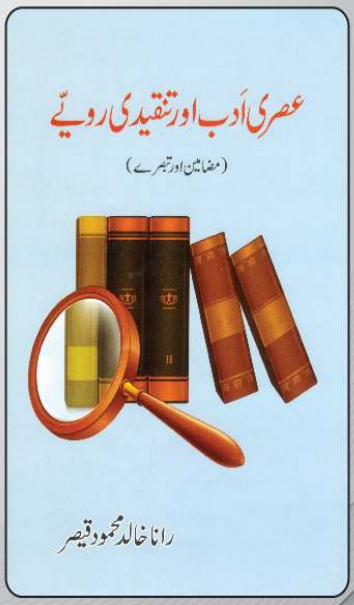
عصری اَدب اور تنقیدی رویّے
(مضامین اور تبصرے)
رانا خالد محمود قیصر

جناب آغا نثار، جناب محمد حنیف، جناب خالد احمد اور جناب اعجاز رضوی

جناب اے جی جوش، جناب خالد احمد اور جناب عمران منظور

ڈاکٹر طلعت شبیر کے شعری مجموعہ ''الگ راستوں کا دُکھ'' کی تقریب رونمائی میں
شریک ڈاکٹر مقصود جعفری، ضیاء اللہ شاہ، ڈاکٹر نثار ترابی، آمنہ سردار اور بشریٰ حزیں